فہرست

مضمون نگاران معارف

۱۵۷ ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۹۶ء تا ماہ جون ۱۹۹۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۵۷

ماہ جنوری ۱۹۹۶ء تا ماہ جون ۱۹۹۶ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

مجلس ادارت

۱۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی　　۲۔ ڈاکٹر نذیر احمد

۳۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی　　۴۔ ضیاء الدین اصلاحی

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپے　　فی شمارہ سات روپے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپے

دیگر ممالک میں سالانہ　ہوائی ڈاک　بیس پونڈ　یا　بتیس ڈالر

بحری ڈاک　سات پونڈ　یا　گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ: حافظ محمد یحیی شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

☆ سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں:

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

☆ رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

☆ خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔

☆ معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔ کمیشن ۲۵٪ ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہیے۔

Accn No. 43999
Class No. Maarif
Book No. 140

معارف

جلد ۱۵۷ ماہ شعبان المعظم ۱۴۱۶ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۹۶ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

آدمی کے اخلاق و اعمال کی اصلاح کے لئے ضروری یہ ہے کہ پہلے وہ اپنے عیوب سے واقف ہو جو نہایت مشکل امر ہے کیوں کہ اسے دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو دکھائی دیتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر بھی نظر نہیں آتا، اور اگر دوسرے لوگ اسے اس کے عیوب سے مطلع کرتے ہیں تو وہ اس کا برا مانتا ہے اور انہیں اپنا بدخواہ، دشمن، حاسد اور نکتہ چیں سمجھتا ہے اور اپنی اصلاح تو در کنار الٹے خود غلطیوں اور عیوب کی نشاندہی کرنے والوں کے پیچھے پڑ جاتا ہے اور ان میں ہزاروں کیڑے نکالنے لگتا ہے، حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ "خدا اس شخص کا بھلا کرے جو میرے عیوب کا تحفہ مجھے بھیجے"، لیکن اب یہ اعلیٰ ظرفی کہاں باقی رہ گئی ہے؟ عیوب سے باخبر کرنے والوں کو نہ کوئی اپنا محسن اور خیر خواہ سمجھتا ہے، نہ ان کا ممنون اور شکر گذار ہوتا ہے، بلکہ ان کی بدگوئی اور عیب جوئی کو اپنا شیوہ بنا لیتا ہے، ایسے حق پسند لوگ نہیں مل سکتے جو اپنی غلطیوں کو بے چون و چرا آسانی سے تسلیم کرلیں اور ان کی بے جا اور دور از کار تاویل نہ کریں۔

عام لوگوں کی خرابیاں اور عیوب اس قدر متعدی اور تباہ کن نہیں ہوتے جس قدر خواص کے ہوتے ہیں، ایک عام شخص اور معمولی آدمی تو اپنی غلطیوں کو مان بھی لیتا ہے لیکن خواص اتنے فراخ دل نہیں ہوتے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرلیں، وہ چاہے زبان سے کچھ کہیں لیکن ان کے طرز عمل سے ظاہر یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے کو عیوب و نقائص سے پاک خیال کرتے ہیں، بڑے بڑے مشائخ و مصلحین سے لے کر قومی و سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کا حال یہی ہے، ان کے ارد گرد جن لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے ان میں ایک طبقہ ان اندھے بہرے غالی معتقدین کا ہوتا ہے جن کو حسن و قبح اور عیب و ہنر کی کوئی تمیز ہی نہیں ہوتی، دوسرا طبقہ مداہنت پسند ہوتا ہے، جو جانتے کے باوجود اپنے مرشدین اور رہنماؤں کے عیوب کے اظہار کو خلاف مصلحت سمجھتا ہے، یہ سب ہی اپنے فائدوں اور ذاتی اغراض کے لئے ان سے وابستہ رہتے ہیں اور عملاً اپنے علماء و مشائخ اور زعماء و قائدین کو ارباباً من دون اللہ سمجھتے ہیں اور اپنی جھوٹی اور خوشامدانہ باتوں اور مبالغہ آمیز تعریفوں سے ان کے عیب کو ہنر بنا کر پیش کرتے ہیں، اس کی وجہ سے اصلاح و ارشاد کے منصب پر فائز لوگوں اور قوم و وطن کے رہبروں کی نظر اپنے عیوب پر نہیں پڑتی اور جو لوگ دردمندی اور دل سوزی سے ان کی نشاندہی کرتے ہیں ان کو رشک و حسد کا نتیجہ قرار دے کر وہ اپنے ضمیر کو مطمئن کرلیتے ہیں، اس طرح وہ اپنی اصلاح و ہدایت کے سارے راستے بند کرلیتے ہیں، ایسی صورت میں وہ عوام پر کس طرح اثر انداز ہو سکتے ہیں؟ اور کیسے ان کی پند و موعظت اور رشد و ارشاد کی باتیں موثر اور دل پذیر ہو سکتی ہیں؟

جن امور پر مذہبی رنگ چڑھا ہوتا ہے، ان میں انسان کو زیادہ دھوکا اور مغالطہ ہوتا ہے، وہ جن کاموں کو دینداری اور نیکی کے کام سمجھتا ہے وہ بھی اس کے غلط ارادہ و نیت اور باطل محرک و جذبہ کی وجہ سے دینی کام نہیں رہ جاتے، ایک شخص بڑے شوق اور دلچسپی سے مسجد و مدرسہ تعمیر کرتا ہے اور بڑے بڑے رفاہی کام کرتا ہے مگر تعمیر پر خرچ ہونے والی رقم ہی ناجائز ہوتی ہے اور اگر جائز بھی ہو تو اس کا مقصود ثواب حاصل کرنا نہیں بلکہ شہرت اور ناموری حاصل کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس کی یہ نیکی برباد ہو جاتی ہے، اس کے پڑوس اور محلے میں نادار اور محتاج لوگ ہوتے ہیں جن کی خبر گیری ان تعمیری کاموں سے زیادہ ضروری اور موجب اجر ہوتی ہے مگر وہ اس کی طرف اس لئے راغب نہیں ہوتا کہ مساجد و مدارس کی تعمیر سے جو دیرپا شہرت حاصل ہوتی ہے وہ غربا و مساکین کو دینے سے نہیں حاصل ہو سکتی، جن کاموں کے نیک و بد دونوں پہلو ہوتے ہیں ان میں آدمی اپنے افعال کو ہمیشہ بہتر ہی خیال کرتا ہے چنانچہ وہ اپنے حریفوں پر رشک و حسد کی وجہ سے خواہ مخواہ ردّ و قدح کرتا ہے اور غلطی سے اس کو حق پرستی کا اقتضا خیال کرتا ہے اور کہتا ہے کہ منکرین حق کے مقابلے میں سکوت ناروا ہے، وہ زہد و اتقا کا اظہار کرتا ہے اور اس ریاکاری کی یہ تاویل کرتا ہے کہ اگر اپنے افعال کا نمونہ لوگوں کو نہ دکھائے گا تو انہیں اچھے کاموں کی ترغیب کیسے ہوگی؟

بعض اخلاقی اوصاف میں نہایت دقیق اور نازک فرق ہوتا ہے، عوام تو در کنار خواص بھی عدم امتیاز کی وجہ سے غلطی میں پڑ جاتے ہیں، بخل و کفایت شعاری، اسراف و سخاوت، پست ہمتی اور قناعت، دنائت اور تواضع، غرور اور خودداری وغیرہ میں اگر ایک چیز معیوب ہے تو دوسری محمود، لیکن ان ملتے جلتے مشتبہ الصورت اوصاف و خصائل میں فرق کرنا مشکل ہوتا ہے، اس لئے اکثر لوگ اسراف کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ سخاوت کر رہے ہیں، پست ہمت ہو کر اپنے کو قانع خیال کرتے ہیں، دنائت کو تواضع اور انکسار کا نام دیتے ہیں اور تکبر اور گھمنڈ کرنے والے اپنے کو خوددار اور غیرت مند بتاتے ہیں، ریاء اور نام و نمود نیکیوں کو برباد کر دیتے ہیں، لیکن ان کی اتنی مخفی قسمیں ہیں جن سے نہایت دقیق النظر اور مبصر اشخاص ہی واقف ہو سکتے ہیں، رشک و حسد کی بیماری اس قدر عام ہو گئی ہے کہ آج جس قدر اچھے اور مفید کام شروع کئے جاتے ہیں وہ اس کی وجہ سے درہم برہم ہو جاتے ہیں، آزادی کے بعد مسلمانوں نے کسی خاص جذبہ سے جن کاموں کا آغاز کیا، خصوصاً انتخابات

کے موقع پر جو تحریکیں، ادارے اور انجمنیں سرگرم عمل ہوئیں ان کو تو درہم برہم ہونا ہی چاہئیے تھا لیکن بہت سی مفید اور تعمیری تحریکیں اور اسکیمیں اسی رشک و حسد کی نذر ہو گئیں۔

آئندہ چند ماہ میں ہندوستان کا جو نیا نقشہ بننے والا ہے، اس کو مسلمانوں کے لئے بہتر اور سازگار بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے دینی و سیاسی زعماء و قائدین اپنی گذشتہ غلطیوں کا اعادہ نہ کریں بلکہ ان کی تلافی کر کے اپنا صحیح سمتِ سفر متعین کریں اور ایسا مدبرانہ فیصلہ کریں جو ملک و ملت کے واقعی مفاد میں ہو، نصف صدی تک قوم ان کی غلط راہنمائی میں وادیِ تیہ میں بھٹکتی رہی ہے اور آج اتنی بے قیمت، بے وزن اور ذلیل ہو گئی ہے کہ خود اسی سے اپنی شکل پہچانی نہیں جاتی، حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو قعرِ مذلت میں پہچانے کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے کے بجائے خود قبول کریں کہ ع اے بادِ صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

خواص، مصلحین اور زعماء اپنے کو عیوب اور غلطیوں سے مبرا نہ خیال کریں بلکہ نہایت بے دردی اور بے رحمی سے اپنے افکار و اعمال کا جائزہ لے کر اپنا احتساب کریں، جوش و جذبہ کے بجائے سوجھ بوجھ اور دور اندیشی کا راستہ اختیار کریں، مسلمانوں کے اختلاف اور فرقہ آرائی کو ہوا دے کر ان کی خانہ بر اندازی نہ کریں، اپنے عیوب اور کمزوریوں کی اصلاح کر کے اپنے وجود کو خود اپنے، اپنی قوم، اپنی ملت اور اپنے ملک کے لئے مفید اور بہتر بنائیں۔

یکم جنوری کو ۸ بجے شب دار المصنفین کے ایک بڑے ہمدرد اور ہر وقت کے حاضر باش ڈاکٹر محمد طاہر صدر شعبۂ اردو شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج انتقال کر گئے، ابھی ان کی عمر ۵۰ برس ہی کی رہی ہوگی لیکن انہوں نے اپنی صلاحیت و ذہانت کے جو نمونے چھوڑے وہ برابر یاد کئے جائیں گے، انہیں تحریر و تقریر دونوں کا ملکہ تھا، پہلی مرتبہ علامہ شبلی کی تاریخ ولادت کا تعین اپنے ایک مضمون میں کیا جو "نیا دور" لکھنؤ میں شائع ہوا، مگر ان کی زیادہ توجہ انتظامی امور کی طرف ہو گئی تھی جس کا انہیں بہت اچھا سلیقہ تھا، اب ان کی سرگرمیوں کا خاص میدان سر سید انٹر کالج صبر حد تھا جس کو پہلے ہائی اسکول اور پھر انٹر کالج بنوایا، اسے ڈگری کالج بنانے کے لئے جان توڑ کوشش کر رہے تھے کہ وقتِ موعود آ گیا، دار المصنفین کے ہر کام میں آگے آگے رہتے تھے، اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر یہاں ہونے والے بین الاقوامی سمینار کے شرکائے طعام کی ذمہ داری جس حسن و خوبی سے انجام دی اس کا اعتراف جناب سید صباح الدین عبد الرحمن مرحوم برابر کرتے تھے، ان سے اور شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے علاوہ اس خاکسار سے بڑا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کی بشری لغزشوں کو معاف کرے اور ان کی مغفرت فرمائے اور ان کے اعزہ خصوصاً بیوہ اور دونوں کم سن بچوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے آمین!

مقالات

اقبال کی علمی جستجو[۱]

شاعری میں وطنیت، آفاقیت اور اسلامی نظریات

از ڈاکٹر مولانا حبیب ریحان خاں ندوی ازہری۔ بھوپال

مواد کی کثرت

بعض ادیبوں، شاعروں اور فلسفیوں کی شخصیت اور فن پر خامہ فرسائی کرتے وقت ایک محقق مواد کی کمی سے دوچار ہوتا ہے، لیکن اقبال جیسی ہمہ گیر، جامع صفات، تنوع پذیر اور متضاد آرا رکھنے والی شخصیت پر قلم اٹھاتے وقت وہ کثرتِ مواد اور ہجوم افکار کے ایک ایسے طلسم ہوش ربا میں گرفتار ہو جاتا ہے کہ اس سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، وہ مفکرین و محققین و ناقدین کی ایسی انتہا پسندانہ افراط و تفریط پر مبنی اور معتدل آرا سے دوچار ہوتا ہے کہ بآسانی ان سے نکلنا دشوار ترین مرحلہ ہو جاتا ہے!

کسی بھی صاحب فن پر لکھنے والا محقق یا ریسرچ اسکالر اپنے ذہنی سانچے، سماجی ماحول، اپنی فکری تربیت اور دینی و اجتماعی آرا سے بالکل آزاد ہو کر قلم نہیں اٹھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال جیسے نابغۂ عصر، عظیم مفکر، ماہرِ فلسفہ و الٰہیات، وطنی و عربی و آفاقی و اسلامی شاعر پر لکھنے والا اپنی مزاجی افتاد، فکری نشو و ارتقاء اور ذہنی کیفیت ہی سے اخذ و استنتاج و استدلال کرتا ہے اور اسی وجہ سے اقبال کے بارے میں متعدد و متنوع

---

[۱] یہ مضمون کل ہند علامہ اقبال ادبی مرکز کے سمینار منعقدہ بھوپال بتاریخ ۱۸ و ۱۹ مارچ ۱۹۸۹ء میں پڑھا گیا تھا۔

اور متضاد فیصلے ہمارے سامنے آتے ہیں جس میں اقبال کے اپنے کلام، متنوع آرا، بعض متضاد مضامین اور فکری و تدریجی مرحلۂ ارتقا سے گزرتے ہوئے کچھ بنیادی تبدیلیوں کا بھی بڑا دخل ہے۔

ہے عجیب مجموعۂ اضداد اے اقبال تو ؎

دارالاقبال بھوپال

سرزمین بھوپال علم و فن کی ترجمان ہے، تاریخ شاہد ہے کہ علم و فن، ادب اور شعر و سخن کی مشہور شخصیتیں بھوپال سے متعلق رہیں، علامہ ابن حجر کی فتح الباری شرح صحیح البخاری پہلی بار ریاست بھوپال کے مصارف سے مصر میں طبع ہوئی تھی، علامہ شبلی نعمانی کی سیرت النبی کے مصارفِ طباعت بھوپال سے ادا ہوئے تھے، اس سے قبل بھی علماء و محدثین اور اہل علم و فضل و کمال کے قافلے بھوپال آتے رہے اور اس رشکِ انجم خطے کو سیراب کرتے رہے اور اپنی شخصیتوں کو بھی پروان چڑھاتے رہے۔

دارالاقبال بھوپال سے اقبال کا تعلق بہت گہرا ہے اور اس موضوع پر بے شمار صفحات منظر عام پر آچکے ہیں، ان کے دیوان میں بھوپال سے متعلق یعنی بھوپال میں کہے ہوئے شعروں کا وجود اس تعلق کو ظاہر کرتا ہے، علامہ اقبال ادبی مرکز کا قیام، اس کا یہ سمینار اور اقبال فہمی و اقبال شناسی کی کوشش، اقبال اوارڈ اور اقبال کے نام اور کام سے متعلق جو مخلصانہ کاوشیں بھوپال سے ہو رہی ہیں ان پر علم و ادب کا ہر شیدا اور اقبال شناس ان کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

اقبال نے تاتاریوں کی تباہ کاریوں اور ہلاکو کی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف چیرہ دستیوں کے بعد اسلام کی اپنی داخلی عملی قوت، عقائد و اجتماعیات و آفاقی توحید اور انسانی مساوات کی تفاعلی اور محرکانہ قوت کا اظہار اس شعر میں کیا ہے ؎

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے　　پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

یورپ کے عظیم مورخین و مفکرین کا خیال ہے کہ اگر اسلام کے عقائد میں اپنی داخلی طاقت اور اندرونی استحکام نہ ہوتا تو تاتاریوں کی اس خارجی یورش کے بعد اسے صفحۂ گیتی سے روپوش ہو جانا چاہیے تھا اور عالمِ فنا کی مہیب وادیوں سے وہ کبھی دوبارہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا تھا۔

لیکن تھوڑا عرصہ نہیں گذرا تھا کہ تاتاریوں نے جب گوشِ دل سے اسلام کے آفاقی پیغام اور عقیدہ و عمل کو سنا تو ان کے کام و دہن اس کی لذت سے آشنا ہوئے اور اسلام کے ماہِ تمام سے ان کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور دل نورِ بصیرت سے سرشار ہو گئے علامہ سید سلیمان ندوی کی زبان میں ؎

نسل سے چنگیز کی سلطانِ دیں پیدا ہوا　　ظلمتِ تاتار سے مہرِ مبیں پیدا ہوا

اس کے بعد چھ سو سال تک اسلام کی عظیم ترقی کے جو دروازے کھلے ان کی تاریخی داستان بیان کرنی یہاں خارج از موضوع ہے۔

شبلی و اقبال پاسبانِ حرم

اقبال کا شعر خود ان کی ذات پر اس طرح صادق آتا ہے کہ مدبر کائنات نے انہیں بھی شبلی نعمانی کی طرح اسلام کی ترجمانی اور حرم کی پاسبانی کے لیے صنم خانے کی آغوش سے نکال کر کعبہ کی دہلیز پر ڈال دیا ؎

میں اصل کا خاص سومناتی　　آبا مرے لاتی و مناتی

لیکن مسلکِ زندگی کی تقویم و تکمیل کے لیے جو دین درکار ہے وہی سرِ حیات ہے اور وہ دینِ محمدی ہے جو دینِ ابراہیمی کی توحید و حنیفیت (شرک سے بیزاری) اور قربانی و اطاعت کا مکمل نمونہ ہے ؎

دیں مسلکِ زندگی کی تقویم　　دیں سرِ محمدؐ و ابراہیم

دل در سخنِ محمدی بند

شبلی کی استادیت اور اسلامی خدمات کا اعتراف | اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام مکتوب میں اس طرح کیا ہے "مولانا شبلی کے بعد آپ استاذ الکل ہیں"[1]

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ "رات کو سیرت نبوی کا مطالعہ کر رہا تھا مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربار نبوی سے عطا ہوگا"[2]

صرف ایک اقتباس اور پیش کرتا ہوں "اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلام کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی کتاب لکھنے کی فرمائش کرتا"[3]

اور اقبال کی اقبال مندی اور بلند طالعی کا عالم تو یہ ہے کہ ان پر لاکھوں صفحات لکھے جا چکے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے اور جب تک کائنات کی تجلی باقی ہے ان کا کلام باقی رہے گا، فکر اقبال، کلام اقبال اور پیغام اقبال اب عالمی اقتدار کا حامل بن چکا ہے، کسی ایک محروم و مظلوم زبان "اردو" کے فنا ہو جانے یا فارسی کے نامانوس ہو جانے سے بھی اقبال کی عالمی شہرت اور پیغام اقبال کی وسعت و ہمہ گیری ختم نہیں ہو سکتی، پیغام اقبال سے شش جہت روشن، ہفت اقلیم منور اور فکر و عمل کی دنیا ہشت بہشت بن گئی ہے اور جس طرح سورج سے اس کی تابانی، چاند سے اس کی درخشانی، شہد سے شیرینی اور پھول سے نکہت آفرینی کو دور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح اقبال کے لاہوتی فکر اور بلند پرواز تخیل سے اس کی اثر انگیزی کو علحدہ نہیں کیا جا سکتا۔

آراء پر تنقید ضروری ہے | اس مدح و ثنا کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ اقبال نے فکر و نظر کے

[1] اقبال کے ممدوح علماء از محمد افضل حق قریشی ص ۱۳۵ منقول از اقبال نامہ حصہ اول ص ۸۔ [2] ایضاً: ۱۳۵ ص ۱۵۔ [3] ایضاً: اقبال نامہ حصہ اول صفحہ ۳۳، ممدوح علماء ص ۱۳۵۔

مسائل میں کہیں ٹھوکر نہیں کھائی ہے، یا ان کے خیالات میں تضاد نہیں ہے یا عقائد و الہیات اور دینی و اجتماعی و سیاسی مسائل میں ان سے اختلاف روا نہیں ہے۔ یا وہ تنقید سے ماوراء ہیں کیونکہ ان کے فکری ارتقاء کے تدریجی مراحل کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خود انھوں نے اپنے نظریات میں تبدیلی کی ہے اور علم و معرفت کے اتھاہ سمندر میں جب جب وہ غوطہ زن ہوئے ہیں انھوں نے فکر و نظر کے جدید آبدار موتی اور لعل بدخشاں برآمد کیے ہیں اور آخر تک ان کی متعدد فکری و فلسفیانہ آراء سے بعض لوگوں کو اختلاف رہا ہے اور اب وقت آگیا ہے کہ ان کے مذہبی افکار پر بھی اسی طرح ناقدانہ تحلیل و تبصرہ کیا جائے جس طرح ان کے ادبی اجتماعی اور فلسفیانہ موضوعات پر کیا جاتا رہا ہے۔ راقم نے اقبال کے بعض اشعار کا تنقیدی جائزہ لیا ہے جن کے پیش کرنے کا یہ موقع نہیں۔

طالب علم کی جستجو، طالب حق کی آرزو | اقبال نے کبھی اس بات کا دعویٰ نہیں کیا کہ ان کے افکار و نظریات تنقید و تبصرہ سے بلند ہیں، ان کے طائر لاہوتی نے علم و فکر و فلسفہ اور معرفت و بصیرت کی جس بلند شاخ سدرہ پر اپنا نشیمن بنایا تھا وہاں سے جہلِ عرفان ناممکن تھا اور پندارِ تکبر کا وہاں گذر نہیں تھا، انھوں نے کبھی اپنے لیے "عقل کل" "علم محیط" "فکر کامل" اور "بصیرت و معرفتِ تامہ" کا دعویٰ نہیں کیا۔ اقبال کبھی اس شعر کے مصداق نہیں بنے ؎

زباں سے گر کیا توحید کا دعویٰ تو کیا حاصل   بنایا ہے بتِ پندار کو اپنا خدا تو نے

علم و ادب اور تحقیق و جستجو کے میدان میں جو شخص تھوڑی بہت کوشش بھی کرتا ہے وہ اس قسم کے غیر علمی اور جاہلانہ دعوؤں سے پرہیز کرتا ہے تو پھر اقبال جیسا محقق و فلسفی اور جویائے حق بھلا کیسے اس میں گرفتار ہو سکتا تھا، راقم کے نزدیک اقبال کی اخلاقی و علمی شخصیت کا سب سے زیادہ دل آویز پہلو یہی ہے کہ وہ ساری عمر ایک طالب علم کی جستجو اور ایک طالب حق

کی آرزو بنے رہے، وہ اپنی آرا و افکار و نظریات کو نہ صرف یہ کہ اپنے استاذوں اور اپنی عمر سے بڑے اہل علم و فضل کے سامنے تنقیح و اصلاح و مشورہ کے لیے پیش کرتے رہے بلکہ اپنے ہمعصروں اور عمر میں چھوٹوں سے بھی وہ اس قسم کی مدد لینے میں نہ کبھی شرمائے اور نہ کبھی ان کا علم و فلسفہ وتحقیق اوران کی عظیم عالمی شہرت اس باب میں حجاب بنی۔

مولانا انور شاہ کشمیری اقبال سے صرف ایک سال بڑے تھے لیکن بعض مسائل میں ڈاکٹر صاحب نے ان سے رجوع کیا ہے۔

علامہ سید سلیمان ندوی ڈاکٹر اقبال سے عمر میں چھوٹے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب کی عالی ظرفی یہ تھی کہ آپ سید سلیمان ندوی کے علمی و فکری وتحقیقی بلند مقام سے پوری طرح آشنا تھے جب کہ بہت سے "قادرانِ زمانہ" انہیں صرف ایک مورخ سے زیادہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں، ڈاکٹر صاحب سید صاحب کے متعلق لکھتے ہیں "آپ امت محمدیہ کے خاص افراد میں سے ہیں اور اس امور من اللہ قوم کے خاص افراد ہی کو امر الٰہی ودیعت کیا گیا ہے۔"[۱]

ایک جگہ لکھتے ہیں "علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد آج ہندوستان میں سوائے سید سلیمان ندوی کے اور کون ہے"[۲]

ایک جگہ سید صاحب کے ہمہ گیر علم اور وسعت نظر کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں "اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کرسکتا، فی الحال انشاء اللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا"[۳]

اقبال مسلمان تھے لیکن علم و فلسفہ اور تحقیق و جستجو کے بعد وہ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ

---

[۱] اقبال کے ممدوح علما، ص ۳۵ منقول از اقبال نامہ حصہ اول، ۹۸، اس قسم کے حوالے ہم یہاں اقبال کے ممدوح علما سے نقل کر رہے ہیں۔ [۲] ایضاً ص ۳۶ منقول از اقبال نامہ ۱: ۱۶۶ [۳] ایضاً: ص ۳۶ منقول از اقبال نامہ ۱۵۱-۱۵۲

"مجھے صحیح معنوں میں سید سلیمان ندوی نے مسلمان بنایا" مولانا عتیق احمد ندوی ان کے اس تاریخی جملے کے گواہ ہیں[۱]

Accession No. 43999
Class No. maarif
Book No. 140

اسی لیے اقبال اپنے اشعار سید سلیمان ندوی کے پاس ارسال کرتے تھے اپنی کتاب اور دیوان بھیجتے تھے اور نجی خطوں میں ان سے مشورے مانگتے تھے اور ان کی تحقیقات سے فائدہ اٹھاتے تھے، ۵ جولائی ۱۹۲۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"پیام مشرق پر جو نوٹ آپ نے معارف میں لکھا ہے اس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ پروفیسر نکلسن کا خط آیا ہے انھوں نے اسے بہت پسند کیا ہے مگر میرے لیے آپ کی داد پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابل افتخار ہے"[۲]

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ AZAMGARH U.P.

اقبال کی فکری و علمی جستجو کا معیار راقم یہاں اقبال کی علمی و فکری جستجو اور تحقیق و تلاش کے معیار کو واضح کرنے کے لیے فلسفہ و توحید، قرآن و سنت و فقہ، تصوف و احسان و اجتہاد، فلک و ہیئت وغیرہ سے متعلق ان کے سوالات کو نقل کرتا ہے جن کا ذہن میں آنا اور پھر ان کو سمجھنے کی ذاتی کوشش، مطالعہ وتحقیق ان کی عظمتِ علمی کا عظیم الشان مظہر ہے، یہ سوالات سید صباح الدین مرحوم نے تاریخ وار درج کیے ہیں[۳]۔

"دریافت طلب امر یہ ہے کہ موکلین و کلا کے پاس جب مقدمات کی پیشی کے لیے آتے ہیں تو ان میں سے بعض پھل پھول یا مٹھائی کی صورت میں ہدیے آتے ہیں،

---

[۱] روزنامہ جنگ کراچی ۲۱ اگست ۱۹۸۶ء کے ایک مضمون "تحریک خلافت و پاکستان میں حصہ لینے والی ایک خاموش شخصیت مولانا عتیق احمد ندوی" تحریر شبیر احمد عثمانی [۲] اقبال کے ممدوح ص ۲۵ از مضمون سید صباح الدین عبدالرحمن [۳] صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا یہ مضمون پہلے چٹان لاہور میں چھپا پھر معارف میں ہم یہ اقتباسات "اقبال کے ممدوح علما" صفحہ ۵۵ تا ۶۰ سے نقل کر رہے ہیں۔

ہدایا نفیس مقررہ کے علاوہ ہوتے ہیں اور وہ لوگ اپنی خوشی سے لاتے ہیں، کیا یہ مسلمان
کے لیے حلال ہے"؟ ۱۰ نومبر ۱۹۱۹ء

"یہ معلوم کرکے تعجب ہوا کہ جیراوالی سب احادیث موضوعات میں ہیں، کیا کلیمنی یا جیرا
بھی موضوع ہے۔[1]" ۱۹۲۰ء

"کیا حکمائے صوفیائے اسلام میں سے کسی نے زمان و مکان کی حقیقت پر بحث کی ہے"۔
۵ اکتوبر ۱۹۲۱ء

"دو باتیں دریافت طلب ہیں ۱۔ متکلمین میں سے بعض نے علم مناظرہ و مرایا کی رو سے
یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ خدا تعالیٰ کی رویت ممکن ہے یہ بحث کہاں ملے گی میں
اس مضمون کو دیکھنا چاہتا ہوں ۲۔ مرزا غالب کے اس شعر کا مفہوم آپ کے نزدیک
کیا ہے؟

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود　رحمۃ للعالمینی ہم بود

حال کے ہیئت داں کہتے ہیں کہ بعض سیاروں میں انسان یا انسانوں سے اعلیٰ تر
مخلوق کی آبادی ممکن ہے اگر ایسا ہو تو رحمۃ للعالمین کا ظہور وہاں بھی ضروری ہے،
اس صورت میں کم از کم محمدیت کے لیے تناسخ یا بروز لازم آتا ہے، شیخ اشراق تناسخ
کی ایک شکل کے قائل تھے ان کے اس عقیدہ کی وجہ یہی تو نہ تھی"۔

"امام ایک شخص واحد ہے یا جماعت بھی امام کے قائم مقام ہو سکتی ہے، ہر اسلامی ملک کا
اپنا ایک امام ہو یا تمام اسلامی دنیا کے لیے ایک واحد امام ہو، مؤخر الذکر صورت
موجودہ فرق اسلامیہ کی موجودگی میں کیونکر بروئے کار آسکتی ہے؟ مہربانی کرکے

[1] جیراوالی اکثر احادیث موضوع یا ضعیف ہیں، بعض حدیثیں قابل اعتبار بھی ہیں، تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں۔

ان سوالات پر روشنی ڈالیے"...... (۱۷ اپریل ۱۹۲۶ء)

"اجتہاد کی بنا محض عقل بشری اور تجربہ و مشاہدہ ہے یا یہ بھی وحی میں داخل ہے۔
اس پر آپ کیا دلیل قائم کرتے ہیں، وحی غیر متلو کی تعریف نفسیاتی اعتبار سے کیا ہے؟
کیا وحی متلو اور غیر متلو کے امتیاز کا پتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں
چلتا ہے، یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں"؟

"حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کے متعلق صحابہ سے مشورہ کیا، کیا یہ مشورہ نبوت کے تحت
میں آئے گا یا امامت کے تحت میں؟ .... امام ابو حنیفہ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی
موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو قیاس اس بچے کے ولد الحرام ہونے پر نہیں کیا
جا سکتا، اس مسئلہ کی اساس کیا ہے"؟ (۲۳ اپریل ۱۹۲۶ء)

اسلام کے کچھ ارکان ہیں۔ احکام میں فرض، واجب، سنت اور مستحب اور حرام چیزیں
ہیں کچھ چیزیں شعار اسلام کہلاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اس کے متعلق اس طرح سوال کرتے ہیں۔

"مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ کا ایک ٹکڑا جو ترجمہ کیا ہے .... اس میں
شعار تعزیرات .... ہے، مہربانی کرکے یہ فرمائیے کہ لفظ شعار سے کیا مراد ہے
اور اس کے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں، اس لفظ کی مفصل تشریح
مطلوب ہے، جواب کا سخت انتظار رہے گا"۔ (۲۴ ستمبر ۱۹۲۹ء)

ڈاکٹر صاحب نے فلسفہ زمان و مکان پر اپنا علمی رسالہ لکھا ہے۔ اس موضوع سے انہیں
بہت دلچسپی ہے، متعدد بار انہوں نے سید سلیمان ندوی سے اس سلسلے میں استفسارات
کیے ہیں چند ملاحظہ ہوں:

"شمس بازغہ یا صدرا میں جہاں زمان کی حقیقت کے متعلق بہت سے اقوال نقل کیے ہیں

ان میں ایک قول یہ ہے کہ زمان خدا ہے، بخاری کی ایک حدیث بھی اسی مضمون کی ہے ... کیا حکمائے اسلام میں سے کسی نے یہ مذہب اختیار کیا ہے اگر ایسا ہے تو یہ بحث کہاں ملے گی؟؟ (۷ مارچ ۱۹۲۸ء)

"کیا یہ ممکن ہے کہ آپ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ قلم بند فرما کر مجھے ارسال فرما دیں، میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا صرف خلاصہ چاہتا ہوں جس کے لکھنے میں غالباً آپ کا بہت سا وقت ضایع ہوگا" (۱۸ مارچ ۱۹۲۸ء)

"اگر دہر ممتد او مستمر ہے اور حقیقت میں اللہ تعالیٰ ہی ہے تو پھر مکان کیا چیز ہے؟ جس طرح زمان دہر کا ایک طرح سے عکس ہے اسی طرح مکان بھی دہر ہی کا عکس ہونا چاہیے یا یوں کہیے کہ زمان و مکان دونوں کی حقیقت اصلیہ دہر ہی ہے، کیا یہ خیال محی الدین ابن عربی کے نقطۂ خیال سے صحیح ہے؟ اس کا جواب شاید فتوحات میں ہی ملے۔ مہربانی کر کے تھوڑی سی تکلیف اور گوارا فرمایئے اور دیکھئے کہ کیا انہوں نے مکان پر بھی بحث کی ہے اور اگر کی ہے تو مکان اور دہر کا تعلق ان کے نزدیک کیا ہے؟ اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں اور جواب جہاں تک ہو جلد مانگتا ہوں"

(۱۵ دسمبر ۱۹۳۳ء)

"مولانا حکیم برکات احمد صاحب بہاری ثم ٹونکی کا رسالہ تحقیق زمان مطبوعہ ہے یا قلمی؟ اگر قلمی ہے تو کہاں سے عاریتاً ملے گا۔ علیٰ ہذا القیاس مولانا شاہ اسمٰعیل کی عبقات، قاضی محب اللہ کی جواہر الفرد اور حافظ امان اللہ بنارسی کی تمام تصانیف کہاں سے دستیاب ہوں گی، جن کتابوں کا آپ نے اپنے والا نامہ میں ذکر فرمایا ہے کیا آپ کے کتب خانۂ دار المصنفین میں موجود ہیں؟ اگر ہوں تو میں چند روز کے لیے وہیں حاضر ہو جاؤں

اور آپ کی مدد سے ان میں سے بعض کو دیکھ سکوں ... حضرت ابن عربی کی بحث زماں کا ملخص اگر عطا ہو جائے تو بہت عنایت ہوگی (۲۲ اگست ۱۹۳۳ء)

"مسلمانوں نے منطق استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو اضافے انھوں نے یونانیوں کی منطق پر کیے ہیں اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔ میں آپ کا نہایت شکرگزار ہوں گا اگر از راہ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں۔ کم از کم ان مقالوں کے نام تحریر فرمایئے جن کو پڑھنا ضروری ہے ..." (یکم فروری ۱۹۳۶ء)

مردانِ خدا خدا نہ باشند لیکن ز خدا جدا نہ باشند

کس کا شعر ہے؟ ایک امر کے لیے اس کی تحقیق ضروری ہے ممکن ہے آپ کی نظر سے کسی تذکرہ میں یہ شعر گذرا ہو۔ (۳ اگست ۱۹۳۲ء)

ڈاکٹر صاحب نے امامت و خلافت، اجتہاد اور طلاق کے مسئلہ پر پہلے سوال کیے تھے، اب مزید نظامِ عالم کی تشکیل جدید میں اسلام کیا مدد کر سکتا ہے، احکام منصوصہ میں امام کو توسیعی اختیارات ہیں یا نہیں اور زمین کی ملکیت کس کی ہے وغیرہ سے متعلق استفسارات پیش ہیں:

"دنیا اس وقت عجیب کشمکش میں ہے .... نظامِ عالم ایک نئی تشکیل کا محتاج ہے۔ ان حالات میں آپ کے خیال میں اسلام اس جدید تشکیل کا کہاں تک ممد ہو سکتا ہے اس بحث پر اپنے خیالات سے مستفیض فرمایئے" (۱۵ جنوری ۱۹۳۴ء)

"احکام منصوصہ میں توسیع اختیارات امام کے اصول کیا ہیں؟ اگر امام توسیع کر سکتا ہے تو کیا ان کے عمل کو محدود بھی کر سکتا ہے؟ اس کی کوئی تاریخی مثال ہو تو واضح فرمایئے زمین کا مالک قرآن کے نزدیک کون ہے؟ .... اگر کوئی اسلامی ملک (روس کی

طرح) زمین کو حکومت کی ملکیت قرار دے تو کیا بات شرعِ اسلامی کے موافق ہوگی یا مخالف؟ اس مسئلہ کا سیاست اور اجتماعِ معاشرت سے گہرا تعلق ہے۔ کیا یہ بات بھی رائے امام کے سپرد ہوگی، صدقات کی کتنی قسمیں اسلام میں ہیں صدقہ اور خیرات میں کیا فرق ہے؟" (یکم فروری ۱۹۳۴ء)

"کیا روسی مسلمانوں میں بھی ابن تیمیہ اور محمد بن عبد الوہاب نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی تھی؟ اس کے متعلق آگاہی کی ضرورت ہے، مفتی عالم جان جن کا حال میں انتقال ہوگیا ہے، ان کی تحریک کی اصل غایت کیا تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود ایک مذہبی انقلاب بھی تھا؟ تکلیف دہی کے لیے معافی چاہتا ہوں اور یہ بھی التماس کرتا ہوں کہ اس عریضہ کا جواب جہاں تک ممکن ہو جلد دیجیے۔" (یکم مئی ۱۹۲۲ء)

"حال میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی کولمبیا نے ایک کتاب شائع کی ہے جس کا نام "مسلمانوں کے نظریہ متعلقہ مالیات" ہے اس کتاب میں لکھا ہے، اجماعِ امت نصِ قرآنی کو منسوخ کرسکتا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اب یہ امر دریافت طلب ہے کہ آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے۔" (۸ اگست ۱۹۲۴ء)

"آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ فقہاء نے اجماع سے نص کی تخصیص جائز رکھی ہے ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہے تو اس سے آگاہ فرمایئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماعِ صحابہ ہی کرسکتا ہے یا علمائے مجتہدین امت بھی کرسکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی حکم ایسا بھی ہے جو صحابہ نے نص قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو اور وہ کون سا حکم ہے۔" (۲۷ اگست ۱۹۲۴ء)

"آپ نے کسی گذشتہ خط میں مجھے لکھا تھا کہ حضور سرورِ کائنات ﷺ سے کوئی مسئلہ دریافت

کیا جاتا تو آپ بعض دفعہ وحی کا انتظار فرماتے۔ اگر وحی نازل ہوتی تو اس کے مطابق مسائل کا جواب دیتے اور اگر وحی کا نزول نہ ہوتا تو قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے۔ اس کا حوالہ کون سی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے؟" (۱۷ اکتوبر ۱۹۲۴ء)

"آیا توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے صرف وہی ناقابل تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہوسکتی ہے۔ آیۂ وصیت پر بھی جو ارشادات ہیں میری سمجھ میں نہیں آئے اس زحمت کے لیے معافی چاہتا ہوں جب فرصت ملے جزئیات سے بھی آگاہ فرمایئے، اس احسان کے لیے ہمیشہ شکر گذار ہوں گا۔" (۸ مارچ ۱۹۳۶ء)

ان استفسارات کے جوابات سید صاحب برابر دیتے رہے جن کا اظہار سید صاحب کے بعض خطوط سے بھی ہوتا ہے۔

"آپ کا نوازش نامہ مسرت روح و اطمینان قلب کا باعث ہے۔" (۱۳ نومبر ۱۹۱۹ء)

"آپ کا نوازش نامہ ابھی ملا ہے جس کے لیے بہت شکر گذار ہوں، جتنی آگاہی آپ نے دیدی ہے وہ اگر زمانہ فرصت دے تو باقی عمر کے لیے کافی ہے۔" (۲۲ اگست ۱۹۲۳ء)

"نوازش نامہ معلومات سے لبریز ہے، نہایت شکر گذار ہوں۔" (یکم فروری ۱۹۲۴ء)

"آپ اپنے نوازش نامہ کی طوالت کی عذر خواہی کرتے ہیں مگر میرے لیے یہ طویل خط باعثِ خیر و برکت ہے اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے میں نے اسے کئی دفعہ پڑھا ہے اور گذشتہ رات چودھری غلام رسول مہر سے بھی پڑھوا کر سنا، دو احباب بھی اس مجلس میں شریک تھے، اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے

یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔" (۲۴ اپریل ۱۹۲۶ء)

لیکن ان خطوط کے جواب کی نقلیں دارالمصنفین کے کتب خانہ اور اوراق میں نہیں ملتیں ور
اب تک منظر عام پر آجاتیں، صباح الدین صاحب کا خیال ہے کہ وہ محفوظ نہیں ہیں
شاید ڈاکٹر صاحب کے کاغذات میں ہوں، راقم کا خیال ہے کہ وہ ضایع ہوگئے، اگر یہ خیال
درست ہے تو یہ علم و تحقیق کی زبردست تباہی کے مترادف ہے، راقم اقبال کے عزیز
فرزند جناب ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب سے پرزور اپیل کرتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے
کاغذات کا از سر نو جائزہ لیں شاید یہ گنجینۂ معانی دریافت ہو سکے۔

ان استفسارات میں جو تنوع پایا جاتا ہے اس کا اندازہ ہر پڑھنے والا لگا سکتا
راقم یہ بھی کہے گا کہ یہ استفسارات صرف علامہ اقبال کے استفسارات ہی نہیں تھے بلکہ
فقہی و اجتہادی سوالات موجودہ دور کے اکثر تعلیم یافتہ حضرات کے ذہنوں میں آتے ہیں
اس لیے ضروری ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے ان سوالات کے جوابات یا توضیح کے لیے علمائے
فن تیار ہوں اور جب یہ سوالات ظاہر ہو چکے ہیں تو ان کے علمی، منطقی اور استدلالی جواب
کتاب و سنت اور عقل و شرع کی روشنی میں ظاہر کیے جائیں اور یہ انتہائی مفید کام ہوگا

شاعر اور فلسفی | ڈاکٹر اقبال کی شاعری، فلسفہ و نظریات اور متنوع خیالات پر مختصر مط
اور محدود وقت میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے کا میں اپنے آپ کو مجاز نہیں سمجھتا لیکن
اقبال کو سمجھنے کے لیے میری ناقص رائے میں ان کی شاعری اور فلسفے کی نوعیت کو سمجھ
ضروری ہے وہ ایک شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی، شاعرانہ نزاکتیں، شاعرانہ اسلوب بیان
مجاز و حقیقت کی ترجمانی اور الفاظ و معانی کی کیفیات ایک خاص رنگ رکھتی ہیں اور
فلسفہ کی نکتہ سنجیاں اور گتھیاں ایک دوسرے انداز بیان اور آہنگ کی محتاج ہیں۔ ڈاک

اقبال کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے فلسفیانہ مسائل کو شعر کی زبان میں نہایت کامیاب طریقہ سے منتقل کیا ہے، ان کے الفاظ، ترکیبوں اور بعض جزوی لغوی و لسانی استعمالات پر تنقید ممکن بھی ہے اور ہوئی بھی ہے لیکن بحیثیت مجموعی وہ ان دونوں وادیوں سے کامیاب و کامران شہسوار بن کر نکلے ہیں ؎

فلسفہ میرے آب و گل میں پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں
اقبال اگرچہ بے ہنر ہے اس کی رگ رگ سے باخبر ہے

شاعری کا مقصد | اقبال کی شاعری کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ ان کی شاعری کا مقصد کیا ہے؟ ان کی شاعری دراصل ایک پیغام ہے بنی نوع انسان کے لیے۔ وہ اپنے مذہبی ماحول، کائنات کے طویل فطری مشاہدے، زمان و مکان کے تصورات اور فلسفہ و مذہب کے عمیق مطالعہ سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کائنات کا یہ وجود خدا کی ذات باجود کی حرکت فاعلہ کا نتیجہ ہے اور اس کے امر تکوینی و مشیئت کے مظہر لفظ "کن" سے کون و مکان وجود میں آیا ہے اور کائنات کے ہر ذرہ کا تعلق مربوط و مستحکم بنیادوں پر قائم ہے اور ابن آدم اس کائنات کا سرتاج ہے اور تعمیر کائنات کی عظیم ذمہ داری اسے سونپی گئی ہے جس کا اصطلاحی نام "امانت" اور "خلافت" ہے۔

اس لیے انسانیت کو ان آفاقی تعلیمات کی ضرورت ہے جو زمان و مکان، رنگ و نسل اور قوم و وطن کے تنگ دائروں میں محصور نہ ہوں، جہاں انسانی حقوق و واجبات اور امیر و غریب کے تمام امتیازات اور فرق فضیلت کا معیار نہ رہیں بلکہ یقین کی پختگی، کردار کی بلندی اور حسن عمل ہی انسانوں کے لیے اعلیٰ نمونہ اور اسوہ ہو۔

علم و فلسفہ کے مطالعہ کے ساتھ ان کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوتا چلا گیا اور وہ ایک منصف محقق کی طرح اس تلاش میں مصروف رہے کہ ان کا یہ آئیڈیل نظریہ کہاں پایا جاتا ہے۔

وہ ایک زمیندار گھرانے کے چشم و چراغ تھے، اسلام پر ان کو مومنانہ یقین تھا، اس کے باوجود وہ علم کے جویا تھے اور انتہائی عالمانہ تجسس اور محققانہ نزاہت کے ساتھ انہوں نے علوم و معرفت کے تمام قدیم و جدید سرچشموں سے سیرابی حاصل کی، انہوں نے قدیم ہندوستانی، یونانی اور رومن فلسفوں اور الہیات کا مطالعہ کیا، اسلام کے مطالعہ میں بھی انہوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا پھر یورپ کے تمام جدید فلاسفہ اور شعراء کا عمیق مطالعہ کیا اور اپنے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ قوم کے سامنے اس طرح پیش کیا ؎

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے صنم کدہ ہے جہاں لا الٰہ الا اللہ

فکری ارتقا | نظم و نثر دونوں میں انہوں نے اپنے نظریات نشر کیے، عمر کی ترقی، ماحول کی تبدیلی، مطالعہ کی زیادتی، فکری ارتقا وغیرہ کے تمام مراحل سے گزرتے ہوئے ان کی آراء میں بعض مواقع پر بظاہر تضاد بھی معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ان کے تاریخی تجربات اور گہری فکر اور سوچ کا نتیجہ ہے۔ لیکن بہر حال ایسی آراء بہت کم ہیں اور جن چیزوں میں بظاہر تضاد معلوم ہوتا ہے وہ غور کرنے سے مربوط کی جا سکتی ہیں اور اگر یہ تضاد باقی رہے تو بھی اس میں اقبال کے مقام عظمت و رفعت کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

قرآن پر مستحکم یقین | یہ حقیقت ہے کہ اقبال کتاب اللہ قرآن پر مستحکم یقین رکھتے ہیں اور

اس کو اقوام عالم کی بیماریوں کا مکمل علاج سمجھتے ہیں ؎

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی علاج اسکا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

خاتم النبیینؐ کی ذات اقدس سے بے پناہ محبت و عقیدت رکھتے ہیں اور اسلام کے کلی نظام کے اجتماعی و سیاسی و مادی فوائد کے وہ قائل ہیں۔

وہ صوفیانہ مزاج رکھنے کے باوجود بعض اوقات تصوف پر سخت تنقید بھی کرتے ہیں لیکن ان کی یہ تنقید اسلامی تزکیہ و احسان پر نہیں ہوتی بلکہ اس عجمی تصوف پر ہوتی ہے جو کتاب و سنت کی تعلیمات سے دور ہے اور عجیب و غریب اصطلاحات اور غموض و اسرار کا حامل ہے، جو لوگوں کو غلامی کی تعلیم دیتا ہے، دنیا سے کنارہ کشی پر ابھارتا ہے اور بدعات کا دروازہ کھولتا ہے اور دن کی روشنی کی طرح واضح دین اسلام کو پیچیدگیوں اور طلسم بندیوں کا دین بنا دیتا ہے اور ظاہر شریعت سے دور ہوتا جاتا ہے اور افراد کے ذاتی تجربات اور آراء و اعمال کا تابع بنا تا ہے۔

وہ مولوی ملا پر بھی جب تنقید کرتے ہیں تو اس سے مراد وہی ملا ہوتے ہیں جو شریعت کے حدود سے تجاوز کرتے ہیں۔ مذہب کے نام پر حصول منافع کا کاروبار کرتے ہیں، تکفیر و تفسیق ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے، لایعنی اور لاطائل بحثوں میں الجھے رہتے ہیں اور عصر حاضر کے جدید رجحانات کی موجودگی میں ان کا اسلامی حل تلاش نہیں کرتے اور کتاب اللہ کی تاویلات باطلہ کے ذریعے اس کے معانی میں تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔

ورنہ اقبال عصر حاضر کے نام نہاد دانشوروں میں پہلے شخص ہیں جو علمائے حق کا حد درجہ احترام کرتے ہیں اور علماء کو ہمیشہ اسلام کے لیے ایک قوت عظیم کا سرچشمہ

سمجھتے ہیں، وہ ابن تیمیہ، شیخ احمد سرہندی اور شاہ ولی اللہ وغیرہ کے قائل ہیں، جمال الدین افغانی کو عصر حاضر کا مجدد مانتے ہیں، شبلی و سلیمان ندوی کے مقام بلند کے معترف ہیں۔

اسلام عصر حاضر کا مذہب اقبال اسلام کو عصر حاضر کا مذہب سمجھتے تھے۔

قسمت عالم کا مومن کوکب تابندہ ہے — جس کی تابانی سے افسون سحر شرمندہ ہے

اور انہوں نے اسلام کی جامع و محکم عالمی تعلیمات کو اپنے انداز میں عصر حاضر کی زبان میں پیش کر دیا۔

اسلام پر ان کا اعتماد جاہلانہ یا تقلیدانہ نہیں ہے بلکہ مجتہدانہ ہے اور انہوں نے دنیا جہان کے تمام قدیم و جدید فلسفے، مذاہب اور انسانی فلاح و بہبود کے نظریات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا ہے کہ اسلام ہی دنیا کے مصائب کا خاطر خواہ علاج پیش کر سکتا ہے۔

وطنیت، آفاقیت اور حجازیت اس روشنی میں جب ان کی وطنیت، حجازیت، آفاقیت اور اسلامیت کا مطالعہ کیا جائے گا تو کسی قسم کی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

یہ صحیح ہے کہ انہوں نے وطن کی محبت میں بے شمار نظمیں کہی ہیں لیکن کسی جگہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ دوسرے وطن والوں سے نفرت و تعصب کا انداز اختیار کرو بلکہ محبت و پیار کے نغموں سے وطن کی عظیم روایات کو باقی رکھو ان کے ابتدائی اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تشنۂ رنگ خصوصیت نہ ہو میری زبان — نوع انسان قوم ہو میری وطن میرا جہاں
آنکھ میری اور کے غم میں سرشک آباد ہو — امتیاز ملت و آئیں سے دل آزاد ہو

دوسری جگہ کہتے ہیں :

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے — تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اسی تباہی کا سبب دوسری جگہ بتاتے ہیں :

شجر ہے فرقہ آرائی تعصب ہے ثمر اس کا — یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

پھر ترانۂ ہندی میں بھی وطنیت کی صحیح تصویر اس طرح کھینچتے ہیں :

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

وہ وطنیت کے اسی جذبے کے مخالف ہیں جو نفرت و تعصب سکھاتا ہے اور جس کی شورشوں کا صحیح اندازہ انہوں نے یورپ میں کیا جہاں خدائے واحد کی پرستش کے بجائے وطن کی زمین پوجی جاتی ہے اور دوسری قوموں کی بربادی کے لیے عظیم جنگوں کی تیاری کی جاتی ہے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے — جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

حجازیت پر تنقید کیوں ؟ بعض ناقدین سرزمین مقدس حجاز سے اقبال کی محبت اور عالم عرب سے ذہنی اور وجدانی تعلق کو وطن پرستی کے خلاف سمجھتے ہیں، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وطن سے نفرت کیے بغیر اگر دنیا کی کسی بھی زمین سے محبت کی جائے تو اس میں کونسی عقلی یا فلسفیانہ قباحت ہے۔

اس محبت کو فلسفۂ حجازیت کے نام سے موسوم کر کے اس پر اعتراض کیا جاتا ہے، اقبال کو یہ حق حاصل ہے کہ جس ماں اور باپ نے اس کو جنم دیا ہے ان سے محبت کرے، جس دھرتی پر وہ پروان چڑھا اور اس کا جسم خاکی پھلا پھولا وہ اس سے محبت کرے اسی طرح جس سرزمین رشک مہر و ماہ و انجم سے روشنی کی وہ ضیا بار کرن نکلی جس نے

اقبال کے روحانی وجود کو زندگی بخشی، اس کی زندگی کو رونق، اس کے دل کو ایمان کی روشنی، اس کے ذہن کو خدا اور خودی کا شعور اور اس کے پورے خاکی وجود کو نور کا پیکر بنا دیا، اقبال کو اس کا آزادانہ حق کیوں حاصل نہیں ہے کہ وہ اس سرزمین سے محبت کرے؟ اس پر نظمیں لکھے اور اپنے عقیدت کے پھول اس پر نچھاور کرے؟ آزادی کے اس دور میں کناڈا کے آبشار، آگرہ کے تاج محل، مصر کے اہرام، اجنتا کے کھنڈر، امریکہ کے پرشکوہ محلوں اور روس کے لینن گراڈ پر قصیدہ گوئی کا حق تو دیا جا سکتا ہے اور وہ آزاد خیالی کی نشانی کہی جا سکتی ہے تو کیا کعبۂ دل بیت معمور کی صفت بیان کرنا اور افضل البشر و اکمل البشر کے مقدس شہر اور مسجد کی تعریف و توصیف اور دل کی مقناطیسی کشش کا اظہار کرنا آزادی کے خلاف اور رجعت پسندی کی علامت ہو سکتی ہے؟

پھر ہندوستان میں رہ کر یورپ و امریکہ چین اور روس کی تعریف اور وہاں کے نظریات کی ترویج کیوں وطن سے محبت کے خلاف نہیں ہو سکتی؟

اسلام عالمی آفاقیت کا دوسرا نام | اسی طرح ایک اور غلط فہمی کی ترویج بھی کی جاتی رہی ہے کہ اقبال پہلے تو رنگ و ملت و آئین کی تمیز کے خلاف تھے اور آفاقیت کے داعی تھے لیکن رجعت پسندی نے ان پر فتح پالی اور وہ مذہب اسلام کے تنگ دامن میں پناہ گزیں ہو گئے۔

آزادی رائے کے پیش نظر ہر ناقد کو اپنے مزاج کے مطابق سوچنے سمجھنے کا حق حاصل ہے اسی فطری حق کی وجہ سے ہمیں بھی اظہار خیال کی آزادی ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ شاعرانہ زبان و بیان اور فلسفی شاعر کے کلام کو سمجھنے کیلئے اپنے مزاج کی اپج کو قربان کرنا ضروری ہے۔ کیا ملت و آئین سے دستبردار ہونے کا

مطلب اقبال یا کسی بھی صاحب فہم و ادراک شخص کا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ہندو رہے نہ کوئی مسلمان نہ کوئی سکھ اور عیسائی اور تمام جنگلی جانور بن جائیں اور کسی آئین و قانون کے پابند نہ رہیں؟ جنگلوں تک میں ایک فطری قانون بقائے اصلح جاری ہے۔ روس میں روسی قانون، چین میں چینی قانون اور ہندوستان میں ہندوستانی قانون ہی نافذ رہے گا آئین سے دستبردار ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان ایک بے آئین قانون درندے کی شکل اختیار کر لے۔

اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ ملت مذہبی و علاقائی قوانین میں گرفتار ہو کر تعصب میں نہ پڑ جائے اور آنکھوں پر ایسی پٹی نہ چڑھا لے کہ اس سے زیادہ بہتر قانون سے نظر چرا لے۔

یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ ساری دنیا کے لیے ایک ملت اور ایک قانون موجود منصف ہو، عادل ہو، انسانی مساوات کا حامل ہو اور ہر دریا، پہاڑ اور زمین کی حد بندی کے ساتھ ساتھ وہ بدلتا نہ ہو اقبال نے یقیناً اپنے پورے فلسفیانہ و عالمانہ تجربات اور دلائل سے اسلام کو ایک عادل و منصف مذہب پایا ہے جس نے کالے گورے اور رنگ و نسل کی تمیز کو اس طرح مٹا کر رکھ دیا ہے کہ تاریخ انسانیت، تاریخ ادیان اور عصر حاضر اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے۔

قدیم انسانی تاریخ ان کرداروں سے بھری ہوئی ہے اور دنیا کی تمام قدیم قوموں نے انسانی کرامت کا خون کیا ہے، نسل، رنگ اور خود ساختہ قوانین کے بل بوتے پر غیر قوموں اور غیر قبیلوں کے ساتھ جو ظلم و ناانصافی سفاکی اور نابرابری کا سلوک کیا ہے اس کی داستان اتنی طویل ہے کہ پوری ایک کتاب اس کے لیے ناکافی ہے۔

عصرِ حاضر کی پیشانی پر ترقی یافتہ ملکوں کی نسل پرستی اور عنصری تفریق و تمیز داغ بنی ہوئی ہے، امریکہ کے اصلی باشندوں کا استحصال جس طرح یورپین اقوام نے کیا ہے وہ عالم آشکارا ہے۔ آج بھی امریکہ کالے اور گورے کے عنصری جھگڑوں کی وجہ سے بدنام ہے اور پوری دنیا کی قوموں کی تباہی کے جہنمی منصوبے وہاں بنائے جاتے ہیں۔

سرخ انقلاب نے خونِ انسانی کو جس طرح ارزاں کیا ہے اور تعصب و نفرت کا جس طرح بازار گرم کیا ہے اور آزادی کا جس طرح گلا گھونٹا ہے اور زیر دست اقوام کے ساتھ اپنی نسلی برتری قائم کرنے کے لیے جو ظلم روا رکھا ہے اس کی داستان سننے سے زمین کا جگر بھی شق ہو جاتا ہے۔

قدیم قوموں نے انسانوں کو ذاتوں میں تقسیم کر دیا تھا، عبرانی قوم نے آسمانی ہدایت پا جانے کے بعد بھی نسلی پندار و تفوق کو اپنی بنیاد بنایا تھا، یورپ کا دین یعنی مسیحیت اپنے حلم و کرم، عالمی محبت اور مساوات کی اقدار کا حامل دین سمجھا جاتا ہے اور اس کا ہر جگہ چرچا کیا جاتا ہے کہ وہ انسانی دین ہے۔ صرف ایک مثال۔ کتاب مقدس بائبل سے پیش کی جاتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بنی اسرائیل کے گم کردہ راہ گروہ کے مقابلہ میں بھی ساری دوسری قومیں کتے کا درجہ رکھتی ہیں۔

"پھر یسوع وہاں سے نکل کر صور اور صیدا کے علاقہ کو روانہ ہوا اور دیکھو ایک کنعانی عورت ان سرحدوں سے نکلی اور پکار کر کہنے لگی اے خداوند ابن داؤد مجھ پر رحم کر۔ ایک بدروح میری بیٹی کو بہت ستاتی ہے۔ مگر اس نے اسے کچھ جواب نہ دیا اور اس کے شاگردوں نے پاس آ کر اس سے عرض کی کہ اسے رخصت کر دے کیونکہ

وہ ہمارے پیچھے چلاتی ہے۔ اس نے جواب میں کہا میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ مگر اس نے آ کر اسے سجدہ کیا اور کہا اے خداوند میری مدد کر۔ اس نے جواب دیا لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔ اس نے کہا ہاں خداوند کیونکہ کتے بھی ان ٹکڑوں میں سے کھاتے ہیں جو ان کے مالکوں کی میز پر سے گرتے ہیں۔ اس پر یسوع نے جواب میں اس سے کہا اے عورت تیرا ایمان بہت بڑا ہے جیسا تو چاہتی ہے تیرے لیے ویسا ہی ہو اور اس کی بیٹی نے اسی گھڑی شفا پائی۔"

(متی ۱۰ - ۲۱ - ۲۸)

مرقس نے بھی یہ قصہ ان الفاظ میں درج کیا ہے۔

"فی الفور ایک عورت جس کی چھوٹی بیٹی میں ناپاک روح تھی اس کی خبر سن کر آئی اور اس کے قدموں پر گری۔ یہ عورت یونانی تھی اور قوم کی سورفینیکی۔ اس نے اس سے درخواست کی کہ بدروح کو اس کی بیٹی میں سے نکالے۔ اس نے اس سے کہا پہلے لڑکوں کو سیر ہونے دے کیونکہ لڑکوں کی روٹی لے کر کتوں کو ڈال دینا اچھا نہیں۔ اس نے جواب میں کہا ہاں خداوند کتے بھی میز کے تلے لڑکوں کی روٹی کے ٹکڑوں میں سے کھاتے ہیں۔ اس نے اس سے کہا اس کلام کی خاطر جا۔ بدروح تیری بیٹی سے نکل گئی ہے۔"

(مرقس ۷: ۲۵-۲۹)

اقبال نے انسانی تاریخ و کردار میں آفاقیت کی کوئی عملی مثال نہیں پائی۔ تنگ نظری، تعصب، نسل پرستی اور قوم پرستی کی وبا نے فطری مذاق میں ایک بگاڑ

پیدا کر دیا، ادیانِ عالم جو ہدایت و مساوات اور انسانی خدمت کے لیے ارسال کیے گئے تھے ان تک میں تحریف نے تمام بنیادی خرابیاں پیدا کر دی تھیں اور پھر عصر حاضر کے جدید نظریات اور ان کی عملی شکلوں نے چنگیز و نیرو کی روح تک کو تڑپتا چھوڑ دیا اور ایسی عالمی ہلاکت کا دروازہ کھولا جس سے نجات کی کوئی راہ نہیں ہے۔

اس لیے اقبال جب آفاقیت سے اسلام کی طرف آتا ہے تو وہ رجعت پسند بن کر نہیں بلکہ جدت پسند اور حقیقت پسند بن کر آتا ہے، اس نے اسلام میں کرامتِ بنی آدم کا جوہر پایا، حبشہ و روم، ایران و عرب اور ساری زمین میں پھیلے ہوئے انسانوں کو جس مساوات کی ضرورت تھی وہ اسلام کے پیغام میں موجود تھی اور پھر زبانی طور پر نہیں بلکہ تجرباتی اور واقعاتی انداز سے اسلام نے اقوام عالم کو اور تمام نسلوں اور رنگوں کو ایک متحدہ صف میں برابری کے ساتھ کھڑا کر دیا۔

اقبال کو فطری، عقلی اور قانونی طور پر یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور تجربات کو بے لاگ طریقے پر واضح کر دیں۔

آج مفکرین یورپ اپنے فلسفۂ مادیت کو، اشتراکی قومیں اپنے فلسفۂ اشتراکیت کو آفاقی کہہ کر اس کی مانگ کر رہی ہیں تو کیا ان پر بھی یہ الزام لگایا جا سکتا ہے کہ وہ تمام دنیا کے نظاموں اور آئینوں کو ختم کر کے رجعیت کا دروازہ کھول رہی ہیں۔

(باقی)

اقبال کامل (از مولانا عبدالسلام ندویؒ) یہ دارالمصنفین کی مشہور و مقبول اور اقبالیات پر نہایت اہم کتاب ہے جس میں ان کے سوانح حیات، فلسفیانہ افکار اور شاعری کے اہم موضوعات وغیرہ پر بحث و تبصرہ کیا گیا ہے۔
قیمت ۴۰ روپے۔

سجدۂ تحیت و تعظیم

از مولوی محمد عارف جمیل صاحب، مبارکپور

"اکتوبر ۱۹۹۵ء میں مولانا سید اخلاق حسین قاسمی کا ایک مضمون "سجدۂ تحیت پر حضرت محبوب الٰہی کی مفصل بحث" شایع ہوا تھا، جس میں صوفیہ کے یہاں رائج سجدۂ تحیت کی اباحت ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کو علمی بحث اور مولانا کے مرتبہ و مقام کی وجہ سے شایع تو کر دیا گیا تھا مگر اصل مقصد یہ تھا کہ دوسرے ممتاز اہل علم اس بارے میں اہل حق کا صحیح مسلک بیان کر دیں تاکہ مولانا اور ان جیسے لوگوں پر اپنے موقف کی غلطی واضح ہو جائے۔ چنانچہ اس کے متعلق تین مضامین ہمیں موصول ہوئے اور بعض کا وعدہ ہے، ہم پہلے موصول ہونے والے مضمون کو شایع کر رہے ہیں جو بہت سنجیدہ، معتدل اور ایک نوجوان عالم کے قلم سے ہونے کی بنا پر قابل قدر ہے۔"

"ض"

سجدہ کے لغوی معنی تواضع، انکسار اور عاجزی کے ہیں، لیکن اصطلاح شرع میں یہ عبادت کے قصد سے پیشانی زمین پر رکھنے سے عبارت ہے (القاموس المحیط للفیروز آبادی ص ۳۶۶ و روح المعانی للآلوسی ۱: ۲۲۸/۱، والتفسیر الکبیر للرازی: ۴۲۶/۱)

اس سجدہ کی دو قسمیں ہیں: سجدۂ عبادت جو غیر اللہ کے لیے کسی بھی شریعت میں

جائز نہیں رہا اس لیے کہ یہ کفر و شرک ہے۔ (تفسیر کبیر ۱/۲۳۶)

دوسری قسم: سجدۂ تحیت و تعظیم کی ہے، اس مختصر مضمون میں اسی قسم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل کی امتوں میں سجدۂ تعظیم و تحیت کا رواج رہا ہے چنانچہ رعایا بادشاہ کو اور لوگ اپنے بڑوں اور پیشواؤں کو سجدۂ تحیت کرتے تھے، قرآن کریم میں ہے:

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوا إِلَّا إِبْلِيسَ أَبَىٰ وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكَافِرِينَ (البقرہ: ۲-۳۴)

اور جس وقت ہم نے فرشتوں (اور جنوں کو بھی) حکم دیا کہ آدم کے سامنے سجدہ میں گر جائیں سو سب بجز ابلیس کے سجدہ میں گر پڑے، اس نے کہنا نہ مانا اور غرور میں آگیا اور کافروں میں سے ہوگیا۔

اس سجدہ کی نوعیت کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام کا تھا یا اللہ تعالیٰ کا تھا اور حضرت آدم علیہ السلام قبلہ کی حیثیت سے تھے، مفسرین دونوں اقوال نقل کرتے ہیں (تفسیر کبیر ۱/ ۲۲۶، تفسیر ابی سعود ۱/ ۴۷۷ و روح المعانی ۱/ ۲۲۸، فتح القدیر للشوکانی ۱/ ۶۶ وغیرہ)

امام قرطبی مالکی لکھتے ہیں:

"اس پر تو اتفاق ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے سجدۂ عبادت نہ تھا، لیکن اختلاف اس میں ہے کہ اس کی کیفیت کیا تھی، جمہور کی رائے یہ ہے کہ ملائکہ کو حکم ہوا تھا کہ پیشانی زمین پر رکھ دیں، جیسا کہ نماز میں ہوتا ہے اور عرف و شرع میں مطلقاً

سجدہ سے یہی مراد ہوتا ہے، بنا بریں یہ بات کہی گئی ہے کہ یہ سجدہ حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم و اکرام اور اطاعت الٰہی کے لیے تھا اور حضرت آدم کی حیثیت قبلہ کی تھی"

لیکن کچھ لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد پیشانی زمین پر رکھنا نہیں بلکہ یہ اپنے اصلی لغوی معنی تذلل و اظہار عاجزی و انکساری پر محمول ہے یعنی حضرت آدم علیہ السلام کے لیے اظہار عاجزی کی اور ان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا (الجامع لاحکام القرآن: ۱/۲۹۱)

حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ سے بھی سجدۂ تحیت کا ثبوت ملتا ہے۔

فرمان باری ہے:

وَرَفَعَ أَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا (یوسف: ۱۲-۱۰۰)

اور اپنے والدین کو تخت (شاہی) پر اونچا بٹھایا اور سب کے سب ان کے (یعنی حضرت یوسفؑ کے) آگے سجدہ میں گر گئے۔

اس آیت کریمہ کی تفسیر میں عام مفسرین مثلاً رازی، آلوسی، قرطبی، ابن کثیر اور شوکانی و سعدی لکھتے ہیں کہ یہ سجدۂ تحیت و تعظیم ان کے یہاں جائز تھا، جیسا کہ آنے والے کے لیے کھڑا ہونا، مصافحہ و دست بوسی وغیرہ، حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ ان کے یہاں بادشاہوں کے دربار میں سلام کرنے کا طریقہ "سجدہ" تھا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سجدۂ تحیت کب تک جائز رہا، ابن کثیر لکھتے ہیں:

"یہ سجدہ ان کی شریعت میں جائز تھا کہ جب وہ بڑوں کو سلام کرتے تو سجدہ کرتے تھے اور اس کی مشروعیت حضرت آدم علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک باقی رہی۔" (تفسیر ابن کثیر ۲/ ۴۹۲)

علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

"اکثر کے نزدیک عہد رسالت سے پہلے تک مباح و جائز تھا، چنانچہ جب صحابۂ کرام نے دیکھا کہ اونٹ اور درخت آپؐ کو سجدہ کرتے ہیں تو عرض کیا ہمیں بدرجۂ اولیٰ آپؐ کو سجدہ کرنا چاہیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ رب العالمین کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرنا چاہیے"۔ (الجامع لاحکام القرآن ۱/۲۰۱، والحدیث عزاہ القرطبی الی سنن ابن ماجۃ، والبستی فی صحیحیہ)

شریعت محمدی اور سجدۂ تعظیم | سجدۂ تحیت اسلامی شریعت میں ناجائز ہے، چنانچہ احادیث نبویہ میں صراحۃً اس کی ممانعت موجود ہے، ذیل میں چند احادیث پیش ہیں۔

إن معاذاً قدم من الشام فوجدهم يسجدون لأساقفتهم فلما رجع سجد لرسول الله فقال: ما هذا يا معاذ! فقال إني رأيتهم يسجدون لأساقفتهم وأنت أحق أن يسجد لك فقال: لو كنت آمراً أحداً أن يسجد لأحد لأمرت المرأة أن تسجد لزوجها لعظم حقه عليها"

رواہ ابن ماجة: ۱/۵۹۵۔

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ یمن سے یہ دیکھ کر واپس آئے کہ لوگ اپنے پیشواؤں کو سجدہ کرتے ہیں تو انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، آپؐ نے فرمایا اے معاذ! یہ کیا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ میں نے دیکھا کہ وہاں لوگ اپنے پیشواؤں کو سجدہ کرتے ہیں پھر آپؐ تو بدرجۂ اولیٰ سجدہ کے حقدار ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو عورت کو دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے کیونکہ شوہر کا اس پر بڑا حق ہے۔

دوسری روایت ملاحظہ ہو:

عن قيس قال: أتيت الحيرة فرأيتهم يسجدون لمرزبان فقلت: رسول الله أحق أن يسجد له قال: فأتيت النبي صلى الله عليه وسلم فقلت له: إني أتيت الحيرة فرأيتهم يسجدون لمرزبان لهم فأنت يا رسول الله أحق أن نسجد لك، قال: أرأيت لو مررت بقبري أكنت تسجد له قال: قلت: لا، قال: فلا تفعلوا، لو كنت آمراً أحداً أن يسجد لأحد لأمرت النساء أن يسجدن لأزواجهن لما جعل الله لهم عليهن من الحق

رواہ ابوداود: ۲/۶۰۵ [۲۱۴۰]

حضرت قیس کا بیان ہے کہ میں حیرہ آیا تو دیکھا کہ لوگ اپنے ایک سردار کو سجدہ کر رہے ہیں، میں نے اپنے دل میں سوچا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ کے زیادہ حقدار ہیں چنانچہ جب میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو عرض کیا کہ حیرہ میں لوگ اپنے ایک سردار کو سجدہ کر رہے تھے، آپؐ تو سجدہ کے زیادہ حق دار ہیں، آپ نے فرمایا کہ اگر تم میری قبر پر گزرو تو کیا اس کو سجدہ کروگے، میں نے کہا نہیں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت بھی نہ کرو، اس لیے کہ اگر میں کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو عورتوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں پر مردوں کا حق رکھا ہے۔

ایک تیسری روایت میں ہے:

عن ابی ہریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم: لوکنت آمرا احدا ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا۔ رواہ الترمذی وقال حسن غریب من ھذا الوجہ: ۳/۳۶۵ [۱۱۵۹]

حضرت ابو ہریرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ اگر میں کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو عورت کو دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

ایک اور روایت دیکھئے:

عن عائشۃ رضی اللہ عنھا ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان فی نفر من المھاجرین والانصار فجاء بعیر فسجد لہ فقال: اصحابہ: یا رسول اللہ! تسجد لک البھائم والشجر، فنحن احق ان نسجد لک فقال: اعبدوا ربکم واکرموا اخاکم ولوکنت آمرا احدا ان یسجد لاحد لامرت المرأۃ ان تسجد لزوجھا:

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ تھے کہ ایک اونٹ نے آکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کیا، یہ دیکھ کر صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! چوپائے اور درخت آپؐ کو سجدہ کرتے ہیں، ہمیں تو بدرجہ اولیٰ آپؐ کو سجدہ کرنا چاہیے تو آپؐ نے فرمایا کہ اپنے رب کی عبادت کرو (یعنی کسی دوسرے کو شریک نہ بناؤ) اور اپنے بھائی (یعنی خود حضور صلی اللہ

(رواہ احمد فی المسند وفی اسنادہ علی بن زید بن جدعان ضعفہ بعضھم ووثقہ ابن معین والنسائی، وبقیۃ رجالہ محتج بھم (الفتح الربانی فی ترتیب المسند ۱۶/۲۲۹)

علیہ وسلم) کا اکرام کرو، اگر میں کسی کو سجدہ کرنے کی اجازت دیتا تو عورت کو دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔

صحابہ کرام کا عمل امام رازی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے کہ جاثلیق نے آکر آپ کو سجدہ کرنا چاہا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا سجدہ نہ کرو، خدا کو سجدہ کرو (تفسیر کبیر ۱/ ۴۳۶)

سجدہ تو دور کی بات ملاقات کے وقت جھکنا بھی شرعاً ممنوع ہے:

عن انس بن مالک قال: قال رجل: یا رسول اللہ! الرجل منا یلقی اخاہ وصدیقہ اینحنی لہ؟ قال: لا ...؟ (قال الترمذی ھذا حدیث حسن رواہ الترمذی: ۵/۷۰ [۲۷۲۸] وابن ماجۃ: ۲/۱۲۲۰ [۳۷۰۲]

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے دریافت کیا: یا رسول اللہ ایک شخص اپنے دوست یا بھائی سے ملاقات کے لیے جھک سکتا ہے، آپؐ نے فرمایا نہیں۔

علامہ قرطبی آیت کریمہ (وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا) کی تفسیر میں مختلف اقوال ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہ جھکنا جو ہماری شریعت میں منسوخ ہے، مصر اور عجمیوں میں اس کی عادت ہے چنانچہ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو جھکتے ہیں خصوصاً امراء اور روساء سے ملاقات کے وقت، یہ لوگ سنت نبوی سے ہٹے ہوئے اور سیدھی راہ سے منھ موڑنے والے ہیں" (الجامع لاحکام القرآن: ۵/۱۷۴ با اختصار)

انھی صریح نصوص کی وجہ سے علمائے امت کا فیصلہ ہے کہ غیر اللہ کے لیے اسلامی شریعت میں سجدۂ تحیت کی کوئی گنجائش نہیں، ذیل میں چند ائمہ کرام کے اقوال پیش کیے جارہے ہیں:

امام قرطبی مالکی (م ۶۷۱ھ) آیت کریمہ (وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلَائِكَةِ اسْجُدُوا) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یہ سجدہ جو ممنوع ہے جاہل صوفیہ نے سماع و استغفار اور مشائخ کے یہاں حاضری کے وقت اس کا معمول بنالیا ہے چنانچہ بزعم خویش جب ان پر غلبۂ حال ہوتا ہے تو قدموں پر گر پڑتے ہیں، اس کی وجہ صرف جہالت ہے، قبلہ و غیر قبلہ کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ ان کی کوشش بے محل اور ان کا یہ عمل بے سود ہے۔" (الجامع لاحکام القرآن: ۱/۲۰۲)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ ایک سوال کے جواب میں فرماتے ہیں:

"زمین بوسی اور سر اٹھانا وغیرہ جس میں سجدہ کا معنی پایا جاتا ہے اور جس کا مشائخ و ملوک کے یہاں رواج ہے یہ چیز ناجائز ہے، بلکہ رکوع کی طرح جھکنا بھی ناجائز ہے، کیونکہ جب صحابہ کرام نے ملاقات کے وقت جھکنے کے متعلق دریافت کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمادیا۔"

اس کے بعد شیخ الاسلام حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اور اس کو دین سمجھ کر کرنا بہت بڑا منکر ہے اور جو شخص اس کو دین داری اور باعث قربت سمجھتا ہے وہ گمراہ اور افترا پرداز ہے، اس کو بتایا جائے کہ یہ نہ دین داری ہے اور نہ ہی باعث قربت، اگر وہ باز نہ آئے تو توبہ کرائی جائے توبہ کرلیتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ قتل کردیا جائے گا۔" (مجموعۃ الفتاوی: ۱/۳۷۲)

شیخ الاسلام مزید لکھتے ہیں:

"سلام کے وقت جھکنا ممنوع ہے جیسا کہ ترمذی کی روایت میں ہے (حضرت انس کی روایت اوپر گذر چکی ہے) نیز اس لیے کہ رکوع و سجدہ غیر اللہ کے لیے جائز نہیں گو کہ انبیائے سابقین کی شریعتوں میں سجدۂ تحیت جائز تھا، جیسا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ میں ہے، لیکن ہماری شریعت میں غیر اللہ کے لیے سجدہ ناجائز ہے بلکہ احادیث میں ملاقات کے لیے کھڑے ہونے سے بھی ممانعت آئی ہے جیسا کہ عجمیوں کا طریقہ ہے، تو پھر رکوع و سجود کی گنجائش کہاں ہوسکتی ہے اور اسی طرح رکوع ناقص (تھوڑا جھکنا) بھی ممانعت میں داخل ہے۔" (مجموعۃ الفتاوی: ۱/۳۷۷)

شیخ الاسلام کے ممتاز شاگرد حافظ ابن کثیر (وَخَرُّوا لَهُ سُجَّدًا) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یہ سابقہ شریعتوں میں جائز تھا کہ بڑوں کو سلام کرتے وقت ان کو سجدہ کرتے اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت تک جائز تھا، لیکن ہماری اس شریعت میں حرام ہے اور سجدہ صرف اللہ جل شانہ کے لیے ہوسکتا ہے۔" (تفسیر ابن کثیر: ۲/۴۹۲)

علامہ شوکانی (وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"سجدۂ تحیت اگر ہماری شریعت میں حرام ہے تو یہ ضروری نہیں کہ دوسری سابقہ شریعتوں میں حرام ہو۔" (فتح القدیر: ۱/۶۶)

حکیم الامت حضرت تھانویؒ حضرت قیس کی حدیث ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض لوگ جو زندہ پیروں کو سجدہ کرتے ہیں یہ بھی جائز نہیں، اگر کسی بزرگ سے قولاً یا فعلاً منقول ہو، تو بحسن ظن اس میں تاویل سکر و غلبہ حال کی کی جائے گی، جس میں معذوری ہے۔" (اصلاح الرسوم ص۹)

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب (وَخَرُّوْا لَہٗ سُجَّدًا) کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اور بعض حضرات نے فرمایا کہ سجدۂ عبادت تو ہر پیغمبر کی شریعت میں حرام تھا لیکن سجدۂ تعظیم انبیائے سابقین کی شریعتوں میں جائز تھا، جو شریعت اسلامیہ میں ذریعۂ شرک ہونے کی بناء پر ممنوع ہوگیا، جیسا کہ حدیث صحیحین میں مذکور ہے کہ کسی غیر اللہ کے لیے سجدہ حلال نہیں۔" (معارف القرآن: ۵/۱۳۵)

شیخ ابوبکر جزائری شرک فی الالوھیۃ ومظاہرہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس لیے کہ رکوع یعنی جھکنا اور سجدہ یعنی پیشانی زمین پر رکھنا ایسی عبادت ہے جو غیر اللہ کے لیے چاہے اس کی حیثیت کتنی بڑی ہو، ناجائز ہے، اگر ایک شخص کسی کو سجدہ کرتا ہے، چاہے تعظیم کے لیے ہو یا طمع و لالچ یا خوف سے، بشرطیکہ وہ اس پر مجبور نہ کیا گیا ہو، تو اس نے شرک کیا اور غیر اللہ کی عبادت کی اور اس کا یہ عمل شرک اکبر ہے، قبل از موت اگر وہ اس سے توبہ نہیں کرتا تو اللہ اس کو معاف

نہیں کرے گا، اس لیے کہ فرمان باری ہے:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ وَمَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِیْدًا۔ (سورۂ نساء آیت: ۱۱۶)

بے شک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا جتنے گناہ ہیں جس کے لیے منظور ہوگا، وہ گناہ بخش دیں گے اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہے، وہ بڑی دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ قاعدہ یہ ہے کہ اگر کوئی چیز فرض و واجب رہی ہو پھر اس کی فرضیت ختم ہو جائے تو اباحت باقی رہتی ہے، جیسا کہ ایام بیض اور عاشوراء کے روزے، ان کی فرضیت تو ختم ہوگئی لیکن استحباب و اباحت باقی ہے اسی طرح سجدۂ تعظیم سابقہ امتوں پر فرض تھا لیکن اس کی فرضیت ہماری شریعت میں ختم ہوگئی تو اباحت باقی رہے گی، اس کا جواب یہ ہے کہ سجدۂ تعظیم اور صوم عاشوراء و ایام بیض میں فرق ہے، ایک کو دوسرے پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں فرق یہ ہے کہ عاشوراء کا روزہ خود ابتدائے اسلام میں فرض و واجب تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے رکھنے کا حکم فرمایا تھا۔

عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: قدم النبی صلی اللہ علیہ وسلم المدینۃ فرأی الیہود تصوم یوم عاشوراء فقال:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ یہودی عاشوراء کا

ماھذا؟ قالوا: ھذا یوم صالح ھذا یوم نجی اللہ بنی اسرائیل من عدوھم فصامہ موسیٰ قال: انا احق بموسیٰ منکم فصامہ وامر بصیامہ۔ (رواہ البخاری: ۲۴۴/۴ [۲۰۰۴])	روزہ رکھتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا کہ یہ کیسا روزہ ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ یہ ایک مبارک دن ہے۔ اس دن اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کے دشمن سے نجات دی تھی، جس کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ نے اس دن روزہ رکھا تھا، آپؐ نے ارشاد فرمایا: ہم حضرت موسیٰؑ کی اقتدا کے زیادہ حق دار ہیں، چنانچہ آپؐ نے روزہ رکھا اور روزہ رکھنے کا حکم دیا۔

لیکن جب رمضان کا روزہ فرض ہوا تو اس کا وجوب ختم ہوگیا اور استحباب باقی رہا۔

عن عائشۃ قالت: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یامر بصیامہ قبل ان یفرض رمضان فلما فرض رمضان کان من شاء صام، ومن شاء افطر۔ (رواہ مسلم: ۹۲/۲، [۱۱۵])	حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رمضان کے روزہ کی فرضیت سے قبل حضور صلی اللہ علیہ وسلم عاشورا کا روزہ رکھنے کا حکم دیتے تھے، لیکن رمضان کی فرضیت کے بعد جس کا جی چاہتا رکھتا اور جس کا جی نہ چاہتا نہ رکھتا۔

یہ تو عاشورا کا روزہ تھا، اسکے برخلاف سجدۂ تعظیم کی فرضیت تو درکنار اس کی اباحت بھی ابتدائے اسلام سے لے کر آج تک نہ رہی، لہذا یہ کہنا کہ جب اس کی فرضیت چلی گئی تو اباحت باقی رہی، بالکل بے محل ہے، کیونکہ یہ ابتداً ہی حرام تھا، جیسا کہ مذکورۂ بالا احادیث سے واضح ہوتا ہے، پھر وجوب کے ختم ہونے کا کیا سوال ہے۔

شرع من قبلنا کی حیثیت اباحت کے قائلین جس چیز کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں اس میں ایک اصولی بحث "شرع من قبلنا" کی آتی ہے، لہذا مناسب ہے کہ اس پر بھی کچھ روشنی ڈالی جائے۔

یہ مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ کیا "شرع من قبلنا" ہم کو لازم ہے؟ چنانچہ بہت سے احناف عموماً شافعیہ و مالکیہ ایک روایت کے مطابق حنابلہ اور متکلمین کی ایک جماعت اس کو لازم قرار دیتی ہے، بشرطیکہ ہماری شریعت میں اسکے منسوخ ہونے کی دلیل نہ ہو۔

لیکن کچھ حنفیہ و شافعیہ و حنابلہ و رازی و آمدی اسکو لازم نہیں قرار دیتے (دیکھئے حاشیہ چلپی مع توضیح و تلویح ص ۲۳۱ و فواتح الرحموت لبحر العلوم لکنوی: ۱۸۳/۲ و روضۃ الناظر لابن قدامۃ: ۱/۱-۳۰ و البحر المحیط للزرکشی: ۳۹/۶۔

قابل غور بات یہ ہے کہ جو لوگ اسکے لزوم اتباع کے قائل ہیں انکے نزدیک بھی یہ شرط ہے کہ ہماری شریعت میں وہ منسوخ و ممنوع نہ ہو، لہذا سجدۂ تحیت کی اباحت کا قول اس بنیاد پر کہ وہ سابقہ امم میں تھا بے بنیاد ہے۔

عرف وعادت کی حیثیت شریعت اسلامیہ میں عرف و عادت کا ضرور اعتبار ہے لیکن اسکے کچھ شروط و قیود ہیں، اولین شرط یہ ہے کہ وہ عرف و عادت کسی نص شرعی کے خلاف نہ ہو، اگر کوئی عرف و عادت نص شرعی کے خلاف ہے تو شریعت میں اسکا کوئی اعتبار نہیں ہوگا، چنانچہ اگر سودی معاملات، شراب نوشی اور کشف عورات کا عرف ہو جائے تو یہ کہکر مباح نہیں کیا جا سکتا کہ یہ عرف و عادت ہے اور شریعت میں اسکا اعتبار ہے (الوجیز فی اصول الفقہ لعبد الکریم زیدان ص ۲۵۶)

علامہ سرخسی عرف کی حیثیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

کل عرف ورد النص بخلافہ فھو غیر معتبر (المبسوط ۱۹۶/۱۲) خلاف نص عرف کا اعتبار نہیں۔

ترجمہ اور اس کے اصول و مناہج

از ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری۔ علی گڑھ

لغت میں ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل کرنے یا تشریح و تفسیر کرنے کو ترجمہ کہتے ہیں[1]، جس کے انگریزی مرادف RENDERING، TRANSLATION، EXPLAINATION اور INTERPRETATION ہیں لیکن اصطلاحاً اسکا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ "النقل من لغۃ الی لغۃ اخری"[2] چنانچہ جب ہم کسی زبان کے متن کو عربی زبان میں منتقل کرتے ہیں تو اس کو ترجمہ کا نام دیتے ہیں، لیکن عربی زبان کے قالب میں پیش کرنے کا مقصد اس کی ثقافت کو دوسری زبان کی ثقافت سے متعارف کرانا ہوتا، تاکہ اس میں وسعت پیدا ہو اور وہ عالمی سطح کے علمی و فکری ارتقاء سے خود کو ہم آہنگ کر سکے تو اس کو تعریب کہا جاتا ہے۔ گویا تعریب کی اصطلاح کا اطلاق عمل ترجمہ کے مقصد پر ہوتا ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ عربی ثقافت کو عالمی سطح پر لے آیا جائے تاکہ وہ انسانی معرفت کی ترقی میں حصہ لے سکے یعنی ترجمہ کے ذریعہ کسی زبان کے علوم و فنون، اس کی تہذیب و ثقافت اور تاریخ و ادبیات کو دوسری زبان کے بولنے والوں سے متعارف کرانے کا اہم فریضہ

[1] القاموس المحیط للفیروز آبادی (فصل التاء باب الجیم)، اور الصحاح للجوہری (رجم)

[2] الصحاح فی اللغۃ والعلوم: بیروت ۱۹۸۴م۔

انجام دیا جاتا ہے، اس تاثیر و تاثر کے نتیجہ میں ایک طرف تو ثقافتوں کا تعامل ہوتا ہے اور دوسری طرف ترجمہ کے ذریعہ زبان میں نئے الفاظ، نئی تعبیرات و اصطلاحات اور ان کے مفاہیم کا بھی اضافہ ہوتا ہے، ترجمہ کا یہی مقصد عباسی دور میں بھی پیشِ نظر تھا کہ عربی ثقافت کو اس وقت کی عالمی ثقافتوں اور ان کے علوم و فنون سے متعارف کرایا جائے اور جدید دور میں بھی عربی زبان و ادب اور ثقافت کے ارتقاء میں ترجمہ کی تحریک کا بڑا دخل ہے

جو زبانیں اپنے خول میں مقید رہنا چاہتی ہیں وہ علمی ترقیات، فکری وسعتوں، ثقافتی لین دین اور بین الاقوامی درجہ حاصل کرنے میں ناکام رہتی ہیں، لیکن جن زبانوں میں اپنی ثقافتی شناخت کے ساتھ تاثیر و تاثر کی خوبی ہوتی ہے وہ اپنے اندر عالمی علمی و فکری سرمایہ کو سمونے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور ہمیشہ شاداب و نمو پذیر رہتی ہیں۔ عربی زبان اس حیثیت سے بڑی وسعت و جامعیت رکھتی ہے۔ اصل سے وابستگی کے ساتھ جمود سے گریز، وسعتِ نظر کی حمایت کے باوجود انحراف سے اجتناب اس کی ایسی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ دیگر زبانوں کے مقابلہ میں زیادہ واضح اور مستحکم اصول و قواعد پر قائم ہے، لہذا دیگر زبانوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے، ان کے استعمال کے طریقوں اور ان کی نوعیت کی تعیین وغیرہ اس کے اپنے متعین اصول ہیں جن کی بنیاد پر وہ اپنی اصل عربیت کو کھوئے بغیر اپنی عالمگیری کو باقی رکھنے پر قادر ہے۔ اب سے بہت پہلے عباسی دور میں بھی اسے بین الاقوامی زبان ہونے کا شرف حاصل ہو چکا ہے اس دور میں ایک طرف تو دیگر زبانوں کے علمی و فکری سرمایہ کو منتقل کرنے کی کوشش ہو رہی

تھی اور بیت الحکمۃ کے دائرہ سے یونانی فلسفہ ایرانی ادب اور ہندوستانی علوم کو عربی زبان میں منتقل کیا جا رہا تھا اور دوسری جانب عام طور پر غیر عربوں میں عربی زبان وادب سے واقفیت حاصل کرنے کا رجحان بڑھا تھا۔ آج جدید دور میں پھر عربی زبان کو اپنی اسی خوبی کی بدولت عالمی زبان ہونے کا شرف حاصل ہے اور اس کے بنیادی اسباب میں ایک اہم سبب ترجمہ و تعریب کی اسی پرانی روایت کا احیا رہا ہے۔ علمی ترقی، صنعتی انقلاب اور بین الاقوامی ضرورتوں نے انیسویں صدی کے اوائل سے اس قدیم روایت کو پھر زندہ کر دیا اور اب اس زبان کا علمی وادبی سرمایہ اس پہلو سے تشنہ نہیں رہا۔ بلکہ اس میں دیگر زبانوں سے ترجمہ کے علاوہ اس کے علوم و ادبیات کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا عمل بھی تیزی سے شروع ہوا۔ تاثیر وتأثر اور ترجمہ و تعریب کے عمل میں تسلسل زبان کے شاندار مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔

ترجمہ کے فائدے وضرورت کے نتیجہ میں اس میں روز افزوں ترقی اور مقبولیت نے عالمی سطح پر اس کی علمی حیثیت کی تعیین؛ اس کے مسائل کے حل اور فنی وتکنیکی دشواریاں پر قابو پانے کی تحریک پیدا کی اور ہر زبان کے علما اور ترجمہ نگاروں نے اس سلسلہ میں اپنے تجربات ومعلومات کی روشنی میں گفتگو کی ہے ترجمہ ترجمہ نگار سے اصل متن کے معانی ومفاہیم کو دوسری زبان میں بجنسہ پیش کرنے کا تقاضا کرتا ہے اس لیے وہ تالیف سے زیادہ دشوار اور عرق ریزی کا طالب ہے جسکو بخوبی انجام دینے کیلئے ضروری ہے کہ ترجمہ کے شرائط[1]

[1] عربی زبان میں ترجمہ کے شرائط واصول پر جاحظ نے کتاب الحیوان میں اور جدید دور کے احمد حسن الزیات انیس المقدسی یعقوب صروف ودیع فلسطین اور عبدالقادر المغربی وغیرہ نے بحث وگفتگو کی ہے، تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو محمد عبدالغنی حسن کی کتاب "فن الترجمۃ فی الادب العربی"۔

ملحوظ رکھے جائیں اور اس کے اساسی نکات پر ذہن کو مرکوز کیا جائے تاکہ اس کا ترجمہ معیاری اور قابل قبول ہو۔

ترجمہ کے اصول وشرائط | اصل متن کی زبان؛ اس کے اصول وقواعد؛ تعبیرات؛ تراکیب؛ اصطلاحات؛ اسالیب؛ اسرار ورموز؛ تاریخ، ادبیات اور تاریخ ادبیات نیز اس زبان کی مخصوص ثقافت اور اس کی تاریخ سے واقفیت اور اس زبان کے ادب کا نکھرا ہوا ذوق مترجم کے لیے اولین شرط ہے۔ اگر وہ اصل متن کی زبان اور اس کے اسالیب وتراکیب وغیرہ سے پوری طرح واقف نہیں ہے تو اسے کسی ادبی وشعری سرمایہ کا ترجمہ کرنے کا بیڑا نہیں اٹھانا چاہیے کیونکہ ہر ادبی تحریر یا شعری کاوش اپنے تہذیبی وثقافتی ماحول کی عکاسی کرتی ہے، وہ تلمیحات کا استعمال بھی کرتی ہے اپنے سے ماقبل ادبی وشعری سرمایہ سے متاثر بھی ہوتی ہے اور ایسے محاوروں کا استعمال بھی کرتی ہے جن کے معنی اس زبان کی تہذیب وثقافت میں پنہاں ہوتے ہیں۔ ہر زبان کی اپنی بعض ایسی نزاکتیں اور باریکیاں ہوتی ہیں جن کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا عمل بڑا نازک اور نہایت عرق ریزی اور کاوش کا متقاضی ہوتا ہے۔ ترجمہ کرنے والے کی خوبی یہ ہے کہ وہ ان لسانی نزاکتوں اور باریکیوں کو ترجمہ کی زبان میں اس خوبی اور مہارت سے منتقل کرے کہ ترجمہ پر اصل کا گمان ہو۔ البتہ خالص علمی وسائنسی چیزوں کے ترجمہ میں ثقافت اور تاریخ لغت وادبیات سے گہری واقفیت کے بغیر بھی محض زبان سے اچھی واقفیت کافی ہے بشرطیکہ مترجم کو اصطلاحات وتعبیرات کا خاصا ادراک ہو تاکہ ان کے مفاہیم کا احاطہ کرنے اور ان کو ادا کرنے والے الفاظ کا انتخاب کرنے میں اس کو کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

جس زبان میں ترجمہ کرنا ہے اس پر اصل متن کی زبان سے کہیں زیادہ عبور اور قدرت ہونی ضروری ہے کیونکہ ترجمہ کرنے والا ادیب و شاعر کے افکار و نظریات، احساسات و جذبات اور معانی و مفاہیم کو ترجمہ کی زبان اور اس کے اسلوب میں اسی وقت ڈھال سکتا ہے جب اس کو ترجمہ کی زبان پر قابو حاصل ہو، نیز وہ اسکی ثقافتی، ادبی اور لغوی تاریخ، اس کے اسالیب و تراکیب، اس کی صرف و نحو، تعبیرات و اصطلاحات، الفاظ کی دلالتوں اور مترادفات کے مابین نازک فرق کا بھی ادراک رکھتا ہو اور اس زبان کے ادب اور اس کی ادبی نزاکتوں کا صاف ستھرا ذوق رکھتا ہو۔ الغرض بغیر دونوں زبانوں سے مکمل واقفیت کے مترجم کسی زبان کے افکار و معانی کو دوسری زبان میں منتقل نہیں کر سکتا، مسئلہ اسوقت زیادہ اہم ہو جاتا ہے، جب دونوں زبانوں میں سے کوئی ایک زبان بھی مترجم کی مادری زبان نہ ہو، ایسی صورت میں مترجم کے لیے اور بھی سخت محنت و ریاضت اور گہرے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اپنی قوتِ فہم اور قوتِ ادا کو مزید وسیع کر کے ہی ایک زبان کی اصل عبارت کے الفاظ و افکار کو کسی غیر زبان میں باقی رکھنے کا فریضہ انجام دے سکتا ہے، اس کے علاوہ اس سخت مرحلہ سے ترجمہ کرنے والا اسی وقت کامیابی کے ساتھ گذر سکتا ہے جب دونوں زبانوں پر عبور کے ساتھ خود اس کا ذوق و حوصلہ بھی اس کو مہمیز کرے۔

جس موضوع کے متن کا ترجمہ مقصود ہے اس علم کے مبادی سے واقفیت مترجم کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ اکثر موضوعات کے اختلاف سے الفاظ، تراکیب اور اصطلاحات کے معنی و مفہوم بدل جاتے ہیں، لہذا موضوع کے بنیادی ڈھانچہ

اور اس کی اصطلاحات کا اتنا علم کم از کم ضروری ہے کہ الفاظ اور جملوں کے مفہوم میں موضوعاتی فرق کو سمجھنے میں غلطی نہ ہو۔ عربی زبان و ادب سے کما حقہ واقفیت رکھنے والا شخص جو انگریزی زبان و ادب سے بھی پوری طرح واقف ہو اور دونوں زبانوں کو جاننے کی تمام شرائط پوری کرتا ہو، اگر علم کیمیا، طبیعیات یا کسی بھی ایسے موضوع کے متن کا ترجمہ کرنے بیٹھے جس کے مبادی کا اسے قطعاً علم نہ ہو اور جسکی اصطلاحات کا اسے ذرا ادراک نہ ہو تو مجرد ترجمہ سے اصل مفہوم کا ادا ہونا قطعاً ناممکن ہوگا۔ مثلاً لفظ "سلوک" کا مفہوم علم نفس میں کچھ ہے، فلسفہ میں کچھ اور، اخلاقیات میں کچھ اور، اسی طرح "اسلوب" لغت میں اسٹائل (STYLE) اور حضارت میں مجموعہ عملیات (PROCESS) کے مفہوم میں آتا ہے۔ "محبت" کے سلسلہ میں قرآن و حدیث کا نظریہ کچھ اور ہے اور نصاریٰ کا کچھ اور۔ الغرض ہر لفظ اپنے محل استعمال اور موضوع کی حیثیت سے بھی معنویت رکھتا ہے جسکی معرفت بہرحال مترجم کے لیے ضروری ہے۔

عملی مرحلہ میں سب سے پہلے متن کو غور سے پورا پڑھ لینا ضروری ہوتا ہے، تاکہ اس میں زیر بحث مسئلہ کی نوعیت، ترتیب افکار کے تسلسل، جملوں کی مخصوص ساخت، الفاظ کی ترکیب اور اس ترکیب سے واضح ہونے والے مفہوم، انداز بیان سے ابھرنے والے تاثر اور احساسات و جذبات کی مخصوص حزنیہ فضا اور طربیہ آہنگ کو مترجم پوری طرح سمجھ لے۔ اگر ایک بار کا پڑھنا متن کو پوری طرح سمجھنے میں ناکافی ہو تو بار بار اس کی قرأت کرنی چاہیے۔

متن کے مفرد الفاظ کے معنی و مفہوم کی تعیین کے لیے جملوں کے مفردات پر

علیحدہ علیحدہ غور و خوض کرنا چاہیے تاکہ الفاظ کے مفہوم بالخصوص جملہ میں اس کے استعمال سے جو مفہوم پیدا ہو رہا ہے اس کو سمجھنے میں کامیابی ہو۔ اس عمل میں معاجم اور ڈکشنریوں کے استعمال کی ضرورت بھی پڑتی ہے لیکن محض معجم پر اعتماد کرکے ترجمہ کے عمل کو کامیابی سے ہمکنار نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بسا اوقات ایک معجم ایک لفظ کے سارے ممکنہ مفاہیم و مدلولات بتانے سے قاصر ہوتی ہے جب کہ دوسری معجم میں اس لفظ کا وہ مخصوص مفہوم مل جاتا ہے جو ہمارے متن میں مقصود ہے۔ مزید برآں ادیب و شاعر اپنی ادبی تحریروں اور شعری کاوشوں میں اپنے جذبات و احساسات اور مخصوص ادبی تجربات کو جن الفاظ اور مخصوص تراکیب کے قالب میں پیش کرتے ہیں ان کا لحاظ معاجم میں تو نہیں کیا گیا ہے، لہٰذا مترجم کو خود سیاق و سباق، ادیب و شاعر کے مخصوص طرز ادا اور اس کی ثقافت کی روشنی میں اس کے پورے ماحول و نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد مجموعی مفہوم، نفسیاتی تاثیر، صوتی مضمرات اور ترکیبی اثرات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصل متن کے الفاظ کے مرادف الفاظ وضع کرنے ہوتے ہیں۔

مفرد الفاظ کے معنی و مفہوم کی تعیین کے بعد جملوں کے معنی اور پھر ایک جملہ کو دوسرے جملہ سے مربوط کرکے متن سے ابھرنے والے معانی و مفاہیم، فکری تسلسل، ادبی چاشنی، معنوی حسن اور بیان کے آہنگ کو پالینے کی کوشش کرنی چاہیے یا اگر متن میں ضعف، پیچیدگی، معنوی سقم اور فکری کجی ہے تو اس کا احساس بھی کر لینا ضروری ہے۔ خاص طور پر عربی زبان کے کسی لفظ کے معنی میں تین عناصر یعنی اصل اشتقاقی معنی، مخصوص صرفی و نحوی حالت اور پھر اس لفظ کی تاریخ کار فرما ہوتے ہیں۔ عربی زبان اس حیثیت سے بھی منفرد ہے کہ لفظ خواہ کوئی شکل اختیار کرے

اس کا رشتہ مادہ یعنی حروف اصلیہ سے نہیں ٹوٹتا۔ اسی طرح لفظ کے معنی میں خواہ کتنی ہی وسعت یا تحدید ہو جائے یا اس کے مدلولات میں کتنی ہی تبدیلی کیوں نہ ہو جائے اس کے تمام معانی میں کسی نہ کسی حد تک اصل کا اشتراک رہتا ہے۔

اصل متن سے مترجم نے جو کچھ سمجھا ہے اس کو ترجمہ کی زبان میں کامیابی سے منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مترجم ادیب و شاعر یا مصنف کی روح سے خود کو قریب کرنے کی کوشش کرے۔ مثلاً حزنیہ احساسات، طربیہ افکار، علمی حقائق، منظر کشی اور تخیلات کو زبان کے قالب میں پیش کرنے کے لیے جو طرز و اسلوب اپنایا گیا ہے یا احساسات کے پس پردہ کون سے حالات و اسباب کار فرما ہیں، ادیب یا شاعر کن تجربات سے گذرا ہے، ان تجربات سے گذرتے وقت اس کے گرد و پیش کا ماحول اور فضا کا احساس و ادراک اور چشم تخیل سے ان کا مشاہدہ کرنے میں اگر مترجم ناکام رہتا ہے تو ترجمہ کے عمل میں اس کو دشواری پیش آسکتی ہے اور اگر اس نے ترجمہ کر بھی لیا تو اس کو اعتبار حاصل نہ ہوگا۔ اسی طرح ہر دور کی زبان و تراکیب میں بھی تبدیلی ہوتی رہتی ہے، کچھ نئے الفاظ داخل ہوتے ہیں، کچھ متروک ہو جاتے ہیں، ایک زمانہ میں ایک لفظ قلیل الاستعمال ہوتا ہے تو دوسرے زمانہ میں وہی لفظ کثیر الاستعمال ہو جاتا ہے، الفاظ کے مدلول میں بھی تحدید و وسعت پیدا ہوتی رہتی ہے، لہٰذا مترجم کو کسی متن کا ترجمہ کرتے وقت اس دور کی زبان اور اس کے معانی پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے جس دور میں وہ متن وجود میں آیا ہے۔

اصل متن کے تئیں امانت و دیانت کا لحاظ رکھنے کے لیے اصل عبارت کے مفہوم کو اس کی مخصوص ترکیب و ترتیب کے ساتھ پیش کرنا ضروری ہے، امانت

و دیانت کو ملحوظ رکھنے سے مراد یہ نہیں کہ ہر لفظ کے مدلول کو اسی نمبر پر لایا جائے جس نمبر پر اصل میں آیا ہے۔ ایسی صورت میں تو ترجمہ کی زبان میں سقم اور خرابی پیدا ہو جائے گی جو سلاست و روانی کو متاثر کر سکتی ہے۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ادیب و شاعر یا مصنف نے جس مفہوم کو جس ترتیب سے ایک یا کئی جملوں میں پیش کیا ہے اس مفہوم کو اسی ترتیب سے ترجمہ کی زبان میں پیش کیا جائے۔ امانت و دیانت کو ملحوظ رکھے جانے سے مراد یہ بھی نہیں ہونی چاہیے کہ مترجم اتنے ہی الفاظ استعمال کرے، جتنے کہ اصل متن کی زبان میں استعمال ہوئے ہیں، کیونکہ اکثر ایک جملہ کا ترجمہ دوسری زبان میں اصل سے کم الفاظ میں کیا جا سکتا ہے یا اس کے برعکس کسی جملہ کا ترجمہ اصل سے زیادہ الفاظ میں ہی ممکن ہوتا ہے۔ اسی طرح بہت سی ترکیبوں اور تعبیروں کو دوسری زبان میں مختلف و متعدد ترکیبوں اور تعبیروں میں ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک متن کے متعدد تراجم کی اہمیت تعبیرات کے تنوع اور مترجمین کی قوت فہم و قوت ادا میں اختلاف و انفرادیت ہی کی وجہ سے تو ہوتی ہے۔

ایک لفظ کے عام طور پر ایک سے زیادہ اور کبھی دسیوں مدلول ہوتے ہیں، جن کا عمیق مطالعہ اور محل استعمال کا علم مترجم کو بخوبی ہونا چاہیے۔ اسی طرح مترادف الفاظ کے مابین جو دقیق فرق اور نزاکت ہوتی ہے اس کا تتبع کرنے کے لیے لفظ کے اشتقاقی معنی، اس کے بعد مختلف ادوار میں اس میں دوسرے معانی و مفاہیم کی شمولیت، اس کے معنی میں کبھی تحدید اور کبھی تعمیم اور اس سے وابستہ مختلف حالتوں اور کیفیتوں وغیرہ پر بھی نظر ہونی ضروری ہے تاکہ ترجمہ اصل سے قریب تر ہو۔ الصدیق اور الانیس یا الزمیل اور الندیم کے عمومی معنی خواہ کتنے ہی

یکساں کیوں نہ سمجھے جائیں لیکن ان کے اصل معنی میں بہر حال حالتوں اور کیفیتوں کا فرق ہے[1]۔ اسی طرح "الشاب" اور "الفتی" کے درمیان جو معنوی فرق ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں، پہلے لفظ کے معنی میں شباب کی کیفیت، حالت اور زمانہ کا پتہ چلتا ہے یعنی جوان ہونا اور سن بلوغ سے تیس سال کی عمر تک کا زمانہ اور دوسرا لفظ نوجوان کے خصائص (سخاوت، جوانمردی، شجاعت، مروت اور کرم وغیرہ) کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ ایسی صورتوں میں مناسب لفظ کا استعمال، مترجم کے علمی تبحر، دونوں زبانوں پر عبور، موضوع سے وابستگی اور صاحب متن کے زمانہ اور اس کی شخصیت تک رسائی اور پھر مترجم کے ذوق پر منحصر ہے۔

جملوں میں ربط و تعلق پیدا کرنے کے لیے جن مختلف قسم کے حروف کا استعمال ہوتا ہے وہ عبارت کے ڈھانچہ کی تشکیل و ترکیب میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ترجمہ کی زبان میں ان حروف کی معنویت کو برقرار رکھنے والے حروف کے استعمال میں ذراسی کبھی غفلت سے عبارت کی معنویت متاثر و مجروح ہو سکتی ہے لہذا اس میں

---

[1] الصدیق معنی پیارا دوست جس میں سچی مودت اور خیر خواہی ہو۔ انگریزی میں اس کیلئے FRIEND یا CONECTED BY BONDS OF FRIEND SHIP آتا ہے۔ الانیس یعنی انس کرنے والا یا وہ شخص جس سے انس و انسیت ہو اس کا انگریزی مرادف CLOSE FRIEND آتا ہے۔ الزمیل سواری پر پیچھے بیٹھنے والے ردیف کو کہتے ہیں، جدید مفہوم میں ہم پیشہ کے معنی میں بھی مستعمل ہے جس کے انگریزی مرادف ASSOCIATE COMPANIAN اور COLLEAGUE ہیں۔ الندیم شراب پینے میں ساتھی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن جدید مفہوم میں معتبر ساتھی کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے، اس کے انگریزی مرادف INTIMATE DRINKING COMPANIAN اور CONFIDANTE ہیں۔

بڑی احتیاط درکار ہوتی ہے۔

اصل متن کے الفاظ وتراکیب کے بین السطور میں جو لب ولہجہ نمایاں ہوتا ہے اور اس میں جو نغمگی جنم لیتی ہے اس کو ترجمہ کی زبان میں پیوست کرنا اور اصل ہی جیسی تاثیر ترجمہ میں بھی پیدا کرنا بڑا مشکل امر ہے جو مترجم کے گہرے مطالعہ، مختلف و متنوع علوم سے واقفیت اور ادبی و فنی ذوق کا متقاضی ہوتا ہے۔ اس مرحلہ میں مترجم کو زیر ترجمہ متن کے مفہوم اور بین السطور کے سمجھنے اور اس کو ترجمہ کی زبان میں ادا کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھنا ہوتا ہے کہ وہ اصل مصنف کے مفہوم اور طرز ادا کا پابند ہے۔ ایسا نہ ہو کہ مترجم کی شخصیت اصل مصنف کی شخصیت پر غالب آجائے۔

اصل متن کا ترجمہ کر لینے کے بعد مترجم کو اس پر اس حیثیت سے نظر ثانی کرنی چاہیے کہ اس کے ترجمہ کی زبان میں اصل زبان کا اسلوب تو نہیں آگیا۔ مثلاً اگر کسی انگریزی متن کا ترجمہ عربی زبان میں کیا گیا ہے تو اس کو عربی زبان کے اسلوب میں ہونا چاہیے نہ کہ انگریزی زبان کے اسلوب میں۔ ترجمہ کی زبان میں اصل زبان کے اسلوب کو داخل کرنے کی صورت میں پیچیدگی، بے ربطی اور اجنبیت پیدا ہوتی ہے اور ترجمہ کی زبان کی سلاست و روانی متاثر ہوتی ہے۔

عربی زبان میں احمد حسن الزیات نے ترجمہ کا جو منہج اپنایا ہے اس پر عمل کر کے ترجمہ کو اصل سے قریب تر کرنے میں خاصی حد تک کامیابی ہو سکتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"میں غیر عربی متن کو پہلے اسی کی زبان کے نظم کے مطابق عربی زبان میں حرفی ترجمہ کرتا ہوں پھر اس پر نظر ثانی کرتا ہوں اور اس کو خالص عربی اسلوب میں ڈھالتا ہوں، اس عمل میں بغیر حذف و اضافہ کے تقدیم و تاخیر بھی کرتا ہوں تیسری بار جب

اس پر نظر ڈالتا ہوں تو اس میں مناسب لفظ، ہم معنی مجاز اور اصل ترتیب کو اپنا کر مولف کی روح و شعور کو اس میں سمو دیتا ہوں، جب ان تینوں مراحل سے فارغ ہو جاتا ہوں تو مجھے یقین کامل ہوتا ہے کہ اگر مولف نے اپنے افسانہ یا قصیدہ کو عربی زبان میں لکھا ہوتا تو وہ اس (ترجمہ شدہ) شکل کے علاوہ کسی اور شکل میں نہ ہوتا"[1]

مولف کی روح کو سمونے کی کوشش میں مترجم کی ثقافت، معرفت، طرز ادا، ذہنی وسعت اور جذب دروں کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ مترجم کے اندر یہ خوبی بہرحال ہونی چاہیے کہ وہ مولف ادیب یا شاعر کی ذہنی اپج، اندرونی کیفیت ادبی خوبی، شعری نکتہ آفرینی اور ادبی و شعری تجربہ کو پالے اور پھر ترجمہ کی زبان میں اسی کشش، اسی حسن و جمال، اسی رنگ و آہنگ، شان و شوکت، سج دھج اور اسی دلکشی اور جاذبیت کے ساتھ پیش کرنے پر قادر ہو جو اصل متن کے بین السطور میں روح کی حیثیت سے جاری و ساری ہے۔ اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اسی معیار کی زبان کو ترجمہ میں بھی استعمال کرے جو اصل زبان کا معیار ہے۔ اگر کسی علمی تحریر کا ترجمہ کرنا ہے تو اس کے ترجمہ کی زبان میں وہی سنجیدگی، وقار اور علمی انداز ہونا ضروری ہے جو اصل تحریر میں ہے، یا اگر بچوں کے ادب کی کسی کتاب کا ترجمہ کرنا ہے تو اس میں ہلکی پھلکی سلیس زبان استعمال کرنی چاہیے، جس میں بچوں کی ذہنی سطح کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

دوران ترجمہ مجاز اور استعارہ کے ترجمہ کا مسئلہ بھی اہم ہے۔ مترجم کو چاہیے کہ پہلے ترجمہ کی زبان میں اسی مفہوم کو ادا کرنے والے مجاز واستعارہ کو تلاش کرے،

[1] ملاحظہ ہو محمد عبدالغنی حسن، فن الترجمۃ فی الادب العربی ص ۲۱۔

لیکن اگر ترجمہ کی زبان کسی مفہوم کو ادا کرنے والے مجاز و استعارہ سے خالی ہے تو مترجم کو اصل عبارت کا ترجمہ کرنا پڑے گا جس میں بڑی مہارت اور نکتہ رسی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طریقہ پر عمل بھی ہو رہا ہے اور مترجمین اکثر مجاز و استعارہ کا ترجمہ کر دیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس عمل کو بلا کسی تحدید کے آزادانہ طور پر اپنانے میں بسا اوقات ترجمہ کی زبان کا اپنا مزاج و تشخص مجروح ہوتا محسوس ہوتا ہے لیکن اگر اسکو محتاط اور ماہرانہ انداز میں ترجمہ کی زبان کے اسلوب کا جامہ پہنایا جائے تو زبانوں کے تعامل کے نتیجہ میں ہر زبان کے الفاظ و اسالیب کے ذخیرہ میں اضافہ ہوتا ہے جو زبان کو نئے مفاہیم اور اس کے ادب کو نئی جہتوں سے روشناس کراتا ہے۔

محاورے کسی زبان کی مخصوص تہذیب و تاریخ سے وابستہ ہوتے ہیں جن کے عموماً لغوی معنی مراد نہیں ہوتے بلکہ موقع و محل کی مناسبت سے ان کا تمثیلی یا تلمیحی مفہوم مراد ہوتا ہے جس کو ادا کرنے کے لیے ترجمہ کی زبان میں بھی کسی محاورہ کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ ایسی صورت میں مترجم کو اسی یا اسی جیسے مفہوم کو ادا کرنے والے محاورہ کو پہلے تلاش کرنا چاہیے لیکن اگر اس میں کامیابی نہ ہو تو احسن طریقہ یہ ہوگا کہ وہ اصل الفاظ کا ترجمہ کرنے کے بجائے اس محاورہ کے محلِ استعمال کی مناسبت سے اس کے تمثیلی یا تلمیحی مفہوم کو ترجمہ کی زبان میں بیان کرے۔ یہی رویہ ان امثال و حکم میں بھی اپنانا چاہیے جو کسی زبان کے ادب کی روح کی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کا برمحل استعمال ادیب و شاعر کی فصاحت و بلاغت پر دلالت کرتا ہے۔

زبانوں کے مخصوص مزاج، لفظوں کے معنی میں وسعت و تنگی اور ترکیبوں اور

عبارتوں کی ساخت کی وجہ سے مترجم کو اکثر ترجمہ کے وقت اصل متن میں حذف و اضافہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، ایسی صورت میں اسے اپنی تمام بصیرت، ذکاوت اور نکتہ رسی کو بروے کار لاکر بہت محتاط رویہ اختیار کرنا چاہیے ورنہ بے اعتدالی کی صورت میں حذف تلخیص اور اضافہ تفسیر و تشریح بن جائے گا جو مترجم کا کام نہیں۔

جدید دور میں عالمی سطح پر معاشی، اقتصادی، سائنسی، سیاسی و سماجی مسائل اور ثقافتی لین دین نے تکنیکی ترجمہ کی اہمیت و ضرورت بڑھادی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد یہ ضرورت اور بڑھ گئی ہے۔ چنانچہ فوری ترجمانی کا کام اب مشینوں سے بھی ہونے لگا ہے۔ جو میکانکی عمل کے ذریعہ ترجمہ کا کام انجام دیتی ہیں اور متبادل الفاظ کو ترتیب دے کر ترجمہ کو سرعت کے ساتھ انسان کے کانوں تک پہونچا دیتی ہیں۔ مگر ان مشینوں کا دائرہ کار عموماً انہی تحریروں یا تقریروں کے ترجمہ تک محدود ہے۔ جن میں اصطلاحات کی مدد سے گفتگو کی جاتی ہے یا جن علوم کا مجرد ترجمہ درکار ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مشینیں عام طور پر ایک لفظ کے لیے ایک ہی لفظ فراہم کرتی ہیں، لہذا سماجی و ادبی موضوعات کا ترجمہ ابھی تک ان مشینوں کے دائرہ سے خارج ہے، اس لیے اب بھی ایسے مترجمین کی ضرورت ہے جو موجودہ تیز رفتار زندگی میں جدید ضروریات کو تکنیکی ترجمہ کے ذریعہ سرعت سے پورا کرسکیں، جن کا سلسلہ اب معاش سے بھی جڑا ہوا ہے۔ انھیں مستقل اور فوری ضرورتوں کے پیش نظر تعلیمی اداروں میں ترجمہ کی تدریس میں مزید اصلاحات اور ترکیز کی ضرورت ہے تاکہ جدید لسانی تجربات سے استفادہ کی راہیں ہموار ہوسکیں، جن کی بنیاد پر ترجمہ کے طریقہ تدریس کی تنظیم نو کرکے اسکو سائنٹفک انداز اور فنی طور پر موضوعاتی حیثیت سے تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اس کی

تدریس کو بھی قلیل المدت اور طویل المدت نصاب کی شکل میں منظم کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے یہاں جن جامعات اور تعلیمی اداروں کے نصاب تعلیم میں ترجمہ کی تدریس کسی نہ کسی صورت میں ہو رہی ہے وہاں باستثناء چند اس کے باقاعدہ نظم پر کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اور مضامین کے نصاب کی طرح ثانوی درجات سے لیکر اعلیٰ درجات تک فن و اصول ترجمہ کی تدریس میں بھی مرحلہ وار نظم و ترتیب کو پیش نظر رکھا جائے، یعنی ہر مرحلہ کی تدریس کے لیے جو رہنما اصول مرتب کیے جائیں انکو پیش نظر رکھ کر مدرسین طلبہ کو دونوں زبانوں کے صرف و نحو اور افعال کی خاصیتیں بتاکر جملوں اور عبارتوں کے ترجمہ کی مشق کرائیں۔ عام طور پر طلبہ کو لفظ کے مخصوص معنی و مفہوم کی تحدید اور اس کو ترجمہ کی زبان میں منتقل کرنے اور اس کے قالب میں ڈھالنے کے عمل میں دشواری پیش آتی ہے۔ اس دشواری پر مشق اور مداومت سے اسی وقت قابو پایا جا سکتا ہے جبکہ طلبہ دونوں زبانوں سے واقف ہوں اور ان میں ذوق و حوصلہ بھی ہو۔ مدرس کو چاہیے کہ وہ پہلے طلبہ کو زیر ترجمہ عبارت کے الفاظ کے معانی کو سمجھنے اور انہیں ذہن نشین کرنے میں مدد دے، اس کے بعد پورے جملہ کے مفہوم کو ذہن نشین کرائے اور صاحب متن کی فکر اور اسکے مقصد کو واضح کرے، اسی کے ساتھ اس کے طرز بیان، جملوں کی ساخت اور الفاظ کی مخصوص ترکیب اور اس سے پیدا ہونے والے مفہوم پر روشنی ڈالتے ہوئے جملہ کے مجموعی مفہوم کو از سر نو واضح کرے اور کم بغیر حذف و اضافہ کے اسکو ترجمہ کی زبان اور اسلوب میں ترتیب دے۔ طلبہ سے ممکنہ مختلف تعبیرات کی بھی مشق کراتا رہے اور اس بات کا خاص خیال رکھے کہ انہوں نے ترجمہ میں کسی اصطلاح یا ترکیب کو ترک تو نہیں کیا ہے یا کوئی ایسا تصرف تو نہیں کیا ہے جو موضوع کی ترتیب پر اثر انداز ہو رہا ہے یا صاحب متن کے مقصد کو فوت کر رہا ہے، ترجمہ کی اولین خوبی یہ ہے کہ وہ نہ ٹھیٹ لفظی ہو کہ اس زبان کا جسمیں ترجمہ کیا جا رہا ہے ذوق و آہنگ ہی ختم کر دے اور نہ اتنا آزاد ہو کہ متن کی روح ہی فنا ہو جائے۔

مصر جدید کی دو اہلِ قلم خواتین

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب۔ لاہور۔

• مصر جدید کے معاصر ادباء میں دو اہل قلم خواتین (۱) عائشہ عبد الرحمٰن بنت الشاطی اور (۲) زینب الغزالی کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں، جن کی شہرت مصر کے حدود سے نکل کر سارے عالم عرب میں پھیل چکی ہے۔ ان کے مختصر سے حالات اور علمی کارگذاری کی تفصیل پیش خدمت ہے۔" (نذیر حسین)

(۱) عائشہ عبد الرحمٰن

عائشہ عبد الرحمٰن ۱۹۱۳ء میں مصر کے ساحلی شہر دمیاط میں پیدا ہوئیں، ان کے والد ایک دینی عالم تھے۔ جو جامعہ ازہر کے تعلیم یافتہ اور ایک دینی مدرسہ میں مدرس تھے عائشہ کی ابتدائی تعلیم ان کے والد کے زیر سایہ گھر ہی میں ہوئی جو سرکاری مدارس میں بچیوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ بعد ازاں وہ اپنی والدہ اور بڑے نانا کے اصرار پر ایک سرکاری مدرسہ میں داخل ہو گئیں، ان کی اعلیٰ تعلیم کا آغاز ۱۹۳۶ء میں جامعہ مصریہ میں شعبہ ادبی (آرٹس) میں داخلے سے ہوا۔

عائشہ عبد الرحمٰن کی زندگی میں جامعہ مصریہ کے ایک اعلیٰ استاد، استاد امین الخولی سے تعارف، ہم ذوقی اور گرویدگی کے بعد اہم موڑ آیا، ۱۹۴۵ء میں عائشہ نے امین الخولی سے رشتۂ زوجیت قائم کر لیا۔ استاد امین الخولی کا سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ انہوں نے

عائشہ کو قرآن پاک کی بلاغت و اعجاز کے پہلوؤں سے آشنا کیا۔ اس کی تفصیل عائشہ نے اپنی کتاب علی الجسر (پل پر) میں بیان کی ہے جو اس کی خودنوشت سوانح ہے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے ابوالعلاء المعری پر تحقیقی مقالہ پیش کرکے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۵۱ء میں قاہرہ کی جامعہ عین الشمس میں عربی زبان و ادب کی پروفیسر مقرر ہوگئیں۔

عائشہ کو طالب علمی کے زمانے ہی سے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ وہ ایک زنانہ رسالہ النہضۃ کے لیے قصائد اور مضامین لکھا کرتی تھیں۔ باپ کے ڈر سے انہوں نے اپنا قلمی نام بنت الشاطی رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد وہ قاہرہ کے مشہور اخبار الاہرام کے ادبی ایڈیشن میں تنقیدی مضامین لکھنے لگیں۔ جامعۂ عین الشمس سے سبکدوشی کے بعد وہ فاس (مراکش) کی دینی درسگاہ جامعۃ القرویین میں علوم قرآن کا درس دینے لگی ہیں۔ وہ استاد زائر کے طور پر سوڈان اور الجزائر کی جامعات کا دورہ کرچکی ہیں اور مصر کے بہت سے علمی اور ادبی اداروں کی سرگرم رکن ہیں اور بہت سے سرکاری اعزاز بھی حاصل کرچکی ہیں۔

استاد امین الخولی کے فیض صحبت اور ان کی ترغیب و تشویق سے عائشہ عبدالرحمٰن نے قرآن مجید کے ادبی پہلوؤں پر مطالعہ و تحقیق کے لیے اپنی زندگی صرف کردی ہے یہی ان کے فکر و نظر کا محور اور علمی سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ ان کا نظریہ ہے کہ قرآن پاک کی ایک آیت کی ایک ہی تفسیر ہوسکتی ہے جبکہ قدیم مفسرین قرآن پاک کے ایک لفظ کے بہت سے معنی لکھ دیتے ہیں حالانکہ یہ تشریح و تعبیر سارے قرآن کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھنے سے ممکن ہوسکتی ہے۔ انہوں نے صحیح لکھا ہے کہ قرآن پاک میں جو لفظ جہاں

اور جس جگہ آیا ہے وہی جگہ اس کے لیے عین موزوں اور مناسب ہے۔ وہ تفسیر میں اسرائیلیات کے تداخل کی شدید ترین مخالف ہیں۔ ان کی رائے میں ان اسرائیلی روایات کا حوالہ اسلام اور مسلمانوں کو ذلیل کرنے اور ساری دنیا پر چھا جانے کی یہودی سازش ہے۔ اس بارے میں ان کی علمی و فکری کاوش کی ترجمان ان کی مشہور کتاب "التفسیر البیانی للقرآن العظیم" ہے جس کے کئی ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔

پبلک لائف میں آنے کے باوجود عائشہ عبدالرحمٰن بڑی دیندار اور قدامت پسند ہیں۔ وہ حریت نسواں کی دعویدار اور پرجوش حامی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ مادر پدر آزادی کی مخالف ہیں۔ ان کی رائے میں جوان لڑکیوں پر والدین کی نگرانی ہونی چاہیے اور خواتین کی جائز آزادی اسلامی اقدار سے متصادم نہیں۔

عائشہ عبدالرحمٰن کی تفسیری خدمات، عربی زبان و ادب سے متعلق مسائل و مباحث پر ماہرانہ نقد و تبصرہ اور اہل بیت نبوی ﷺ کی سوانح نگاری نے انہیں عرب دنیا کا مقبول اور محبوب مصنف بنا دیا ہے۔

عائشہ کی تصانیف عائشہ کی علمی کارگذاری بڑی تفصیل طلب ہے۔ بہرحال ان کی اہم تصانیف حسب ذیل ہیں:

۱۔ ام النبی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ محترمہ کے حالات)، قاہرہ ۱۹۶۱ء

۲۔ نساء النبی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے حالات)، اس کتاب کا ترجمہ فارسی اردو اور انڈونیشی زبان میں ہوچکا ہے۔

۳۔ التفسیر البیانی للقرآن العظیم (قرآن پاک کی ادبی اور بلاغی تفسیر) یہ مصنفہ کی اہم ترین علمی کاوش ہے۔ اس کے بہت سے ایڈیشن شایع ہوچکے ہیں۔

۴۔ بنات النبی (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادیوں کے سوانح) قاہرہ ۱۹۶۳ء

۵۔ السیدۃ زینب بطلۃ الکربلاء (حضرت حسینؓ کی ہمشیرہ اور حضرت علیؓ کی بیٹی کے احوال) قاہرہ ۱۹۶۵ء۔

۶۔ علی الجسر اسطورۃ الزمان (فاضلہ مصنفہ کی خود نوشت سوانح)

۷۔ القرآن والتفسیر العصری (ایک ترقی پسند مصری ڈاکٹر، ڈاکٹر محمود کی کتاب کے جواب میں) مطبوعہ قاہرہ۔

۸۔ الاسرائیلیات فی الغزو الفکری (اسرائیلی روایات کی علمی فتوح) قاہرہ ۱۹۷۰ء

گذشتہ بیس بائیس سال میں عائشہ پر بہت سے علمی مقالات اور کتابیں شایع ہوچکی ہیں اور بعض جامعات نے ان پر ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں بھی دی ہیں۔

(۲) زینب الغزالی

گذشتہ نصف صدی میں جن خواتین نے مصر میں تعلیمی، اصلاحی اور فلاحی کارنامے انجام دیے ہیں، ان میں محترمہ زینب الغزالی کا نام سرفہرست ہے۔ وہ نامور اہل قلم اور اخوان المسلمون کی زنانی شاخ اخوات المسلمین کی بانی بھی ہیں۔

زینب الغزالی ۱۹۱۷ء میں ایک ازہری عالم اور روئی کے ایک بڑے تاجر کے ہاں پیدا ہوئیں۔ سرکاری مدارس میں تعلیم حاصل کرنے کے علاوہ ان کی دینی تعلیم و تربیت گھر ہی میں ہوئی اور انہوں نے تفسیر، حدیث میں بہت سی سندات حاصل کیں۔

زینب کے والد بچیوں کی دینی رہنمائی کے لیے مشہور صحابیہ نسیبہ بنت کعب المازنیہ کو بطور مثال پیش کیا کرتے تھے، جس نے جنگ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

دوش بدوش حصہ لیا تھا۔

جب زینب کی عمر اٹھارہ برس ہوئی تو انہوں نے جماعۃ السیدات المسلمات کے نام سے ایک دینی جماعت قائم کرلی، جس کے ارکان کی تعداد جلد ہی تیس لاکھ تک پہنچ گئی، لیکن ۱۹۷۷ء میں مصری حکومت نے اسے خلاف قانون قرار دیا۔ وہ جامع ابن طولون میں ہر جمعہ مسلم خواتین کو وعظ و نصیحت کیا کرتی تھیں جبکہ ماہ رمضان میں ان سامعات کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ جاتی تھی۔ خواتین کی دینی تربیت کے علاوہ زینب کی جماعت نے ایک یتیم خانہ قائم کر رکھا تھا۔ انہوں نے ایک رسالہ بھی جاری کیا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خاندانی تنازعات میں ثالثی اور غرباء کی امداد بھی کیا کرتی تھیں۔

۱۹۴۹ء میں محترمہ زینب جناب حسن البناؔ کے شدید اصرار پر جمعیۃ اخوان المسلمین میں باقاعدہ شامل ہوگئیں۔ ۱۹۵۰ء میں وہ ان مصری مصیبت زدگان کی دستگیری کرتی رہیں جو حکومت کے عتاب کا شکار ہوئے تھے۔ یہ لوگ ایک وقت میں گھر کے خوش حال تھے لیکن اب مال و متاع کی ضبطی کے بعد کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے تھے۔ ۱۹۶۰ء میں انہوں نے خواتین کی تمام جماعتوں میں اتحاد قائم کردیا۔ ۱۹۶۵ء میں حکومت کی مخالفت کے الزام میں ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں پچیس ۲۵ سال قید بامشقت کی سزا ہوئی، لیکن انور السادات کے عہد حکومت میں انہیں ۱۹۷۱ء میں رہا کردیا گیا۔

زمانۂ اسیری کی داستان انہوں نے اپنی مقبول و معروف کتاب "ایام من حیاتی" میں بیان کی ہے۔ ان پر جبر و تشدد کے واقعات پڑھ کر ایک انسان حیرت زدہ

ہو جاتا ہے۔ قید خانے میں وہ بہت سے مقامات اور مبشرات سے سرفراز ہوئیں جو انکی دل جمعی اور قید تنہائی میں بہت بڑا سہارا ثابت ہوئے۔ وہ بیان کرتی ہیں کہ صدر جمال عبدالناصر کو ان سے ذاتی عداوت ہوگئی تھی، جس کے پیدا کرنے میں اخبارات اور بعض بیرونی طاقتوں کا بڑا حصہ تھا، وہ سختی سے انکار کرتی ہیں کہ جمال عبدالناصر کے قتل میں جمعیۃ اخوان المسلمون کسی طرح بھی ملوث تھی کیونکہ دہشت انگیزی، مار دھاڑ اور قتل وغارت اخوان کے منشور میں شامل ہی نہیں اور کسی ظالم حکمران کی موت سے ملک کے حل طلب مسائل ختم نہیں ہوسکتے۔ اس کتاب میں وہ شدت سے اس کا انکار کرتی ہیں کہ اخوان مصری حکومت پر قبضے کے طلبگار یا حریص تھے یا ان کا عقیدہ ہے کہ جو شخص اخوان سے تعلق نہیں رکھتا وہ پکا مسلمان ہی نہیں۔ ایک زمانہ میں وہ ایرانی انقلاب کی پُرجوش حامی تھیں لیکن بعد میں انقلابیوں کی انتہاپسندی اور تشدد آمیز سرگرمیوں کی وجہ سے مخالف ہوگئی ہیں۔

جیل سے رہائی کے بعد زینب الغزالی درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول ہوگئی ہیں۔ ستمبر ۱۹۸۱ء میں انور السادات کی حکومت نے اخوان المسلمون کا ایک ماہانہ رسالہ "الدعوۃ" بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد دوسرے رسالے "لواء الاسلام" کا یہی حشر ہوا۔ انہوں نے الدعوۃ کا دوبارہ اجراء کرایا اور اس کے ایک حصے میں عورتوں اور بچوں کے لیے مضامین لکھنے لگیں۔ مصری عورتوں کے نام ان کا ہمیشہ یہ پیغام ہوتا تھا کہ وہ تعلیم کے ساتھ ساتھ گھر میں اپنے خاوندوں کی تابعدار اور فرماں بردار بن کر رہیں اور کم از کم بچوں کی پرورش کے زمانے میں گھر ہی میں قیام کریں۔ ان کی دانست میں معاشرے کی بہت سی خرابیوں کی ذمہ دار خاتونِ خانہ کی

بیرونی مصروفیتیں ہیں۔ ان کی رائے میں اسلام عورت کو ہر قسم کی پبلک زندگی میں حصہ لینے کی اجازت دیتا ہے بشرطیکہ سماجی سرگرمیاں، گھریلو فرائض (بطور بیوی اور والدہ) میں مزاحم نہ ہوں۔

زینب نے دو شادیاں کیں لیکن دونوں ناکام ثابت ہوئیں۔ اصلاحی دینی اور فلاحی خدمات کے سبب ان کو مصر میں بے پناہ مقبولیت و محبوبیت حاصل ہے۔

اب محترمہ زینب الغزالی مادر مصر کے طور پر مشہور ہیں اور سب چھوٹے بڑے ان کی بہت تکریم وتعظیم کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں آزادی نسواں کے بہت سے دعویدار اور خدمت گذار اکابر ہوئے ہیں، لیکن زینب الغزالی کی شخصیت مینارِ نور کی طرح ان کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

تصانیف | زینب الغزالی نے متعدد اخبارات ورسائل میں بے شمار مضامین لکھے ہیں۔ ان کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ایام من حیاتی: یہ کتاب ان کے زمانۂ اسیری کی دلچسپ داستان ہے، جس میں ان کے حیرت انگیز مشاہدات اور تجربات محفوظ ہیں۔ کتاب متعدد بار قاہرہ اور بیروت سے شایع ہوچکی ہے اور شاید ایک دو اسلامی زبانوں میں بھی اس کا ترجمہ ہوچکا ہے۔

۲۔ نحو البعث الجدید (دوبارہ زندگی کی طرف)، قاہرہ ۱۹۵۹ء۔

یورپ اور امریکہ کے رسائل میں ان کی حیات وآثار اور افکار ونظریات پر بہت سے مضامین شایع ہوچکے ہیں۔ (آکسفورڈ آف ماڈرن اسلامک ورلڈ)

جنوبی افریقہ میں قادیانی تحریک کی بیخ کنی

از پروفیسر سید حبیب الحق ندوی۔ ڈربن

جنوبی افریقہ جو فطری وسائل اور معدنیات (سونا، ہیرا، یورنیم وغیرہ) کی دولت سے مالا مال ہے۔ تقریباً ساڑھے تین سو برس تک مغربی سفید استعمار کے زیر نگیں رہا۔ ڈچ (اہل ہالینڈ) اور برطانوی استعمار اس پر حکومت کرتے رہے۔ آخر ان کی عمر پوری ہوئی اور وہ راہی عدم کے مسافر ہوگئے۔ ۱۹۹۰ء سے ۱۹۹۵ء تک پانچ سالوں کے عرصہ میں عظیم انقلابات رونما ہوئے۔ صدر منڈیلا پورے ساڑھے ستائیس (۲۷½) برس کی قید کے بعد آزاد ہو کر نئے جنوبی افریقہ کے معمار کی حیثیت سے منظر عالم پر نمودار ہوئے۔ دنیا میں ان کا وقار بڑھتا گیا، اس لیے کہ اس قلیل عرصہ میں قومی عوامی اور مقامی انتخابات کے ذریعہ موصوف نے ملک کو جمہوریت کی شاہراہ پر کھڑا کر دیا اور ملک کے جمہوری سانچوں کی داغ بیل ڈال دی۔

مسلمانوں کی آمد

مغربی استعمار نے عالم اسلام پر جو تسلط قائم کیا تھا وہ بھی بتدریج ختم ہو گیا۔ انڈونیشیا پر ڈچ حکمران پورے ساڑھے تین سو برس تک مسلط رہے۔ انڈونیشیا کے ساتھ ملیشیا کے جزائر بھی ان کے زیر نگیں رہے۔ مقامی مسلم سلاطین اور حکمران جو راجہ کے نام سے بھی معروف تھے استعمار کے ساتھ نبرد آزما ہوئے۔ استعمار نے انہیں قید کر کے پابہ زنجیر جنوبی افریقہ میں لاکر نظر بند کیا۔ انہیں میں

ایک راجہ تنبورا (TANBORA) بھی تھے۔

کیپ میں مسلمانوں کی پہلی آمد ۱۶۵۸ء میں بتائی جاتی ہے جب مسلمانوں کی ایک جماعت (MARDYCKERS OF AMBOYA) یہاں بطور غلام ملیشیا وغیرہ کے علاقوں سے لائی گئی۔ کیپ کے رجسٹر میں انہیں غلام (SLAVES) کی حیثیت سے درج کیا گیا۔ اس کے بعد سے مسلم قیدیوں کی آمد جاری رہی۔ راہ حریت کے متوالے جو ڈچ استعمار کے خلاف نبرد آزما تھے گرفتار کر کے یہاں لائے گئے اور جزیرہ رابن کے قید خانوں میں رکھے گئے۔ ان ممتاز شخصیات میں شیخ یوسفؒ کا نام نامی قابل ذکر ہے۔ موصوف بانٹم (BANTAM) میں شاہی امام تھے۔ وہ ڈچ کے خلاف بانٹم کے مسلم حکمران کے ساتھ جنگ آزادی میں شریک تھے۔ چونکہ وہ شاہی مسجد کے امام تھے اس لیے ڈچ نے انہیں ۱۶۹۴ء میں لاکر غلاموں کے زمرہ سے الگ رکھا۔ کیپ کے گورنر سے موصوف کے اچھے تعلقات تھے اسی بنا پر موصوف نے درخواست کی کہ وہ تنبورا کے راجہ کو جیل سے نکال کر علیحدہ علاقہ میں منتقل کردے۔ شیخ یوسف کی وفات کے بعد ان کے مریدین ملیشیا واپس چلے گئے اور ان کی لڑکی سے راجہ تنبورا کی شادی ہوگئی۔ راجہ نے حافظہ کی مدد سے قرآن کریم کا پورا نسخہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر گورنر کیپ کی خدمت میں پیش کیا۔ ۱۹۹۴ء میں جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی آمد کی تین سو سالہ تقریبات تزک و احتشام کے ساتھ منائی گئیں۔ صدر منڈیلا نے تقریب کا افتتاح کیا۔ سارے ملک میں قرآن خوانی کے ساتھ دیگر تقریبات کا اہتمام کیا گیا۔

مسلمانوں کی آمد کی یہ مختصر ترین یادداشت اس لیے اہم ہے کہ چند نفوس زکیہ

اور مخلصین لہ الدین نے اس ملک میں مذہب اسلام اور قرآنی کلچر کی داغ بیل
ڈال کر امت کے لیے وسعت ارضی میں اضافہ کیا۔ انہوں نے روز اول سے اسلامی
روایات، عقائد اور عبادات کے تحفظ پر زور دیا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے مدارس و مر
قائم کیے، مسلم غلاموں کا یہ قافلہ آخر آزادی کی نعمت سے شاد کام ہوا اور سیاسی
قیدی آزاد شہری ہو گئے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کیپ میں ڈچ میں رفارم چرچ
کے علاوہ کوئی دوسرا مذہب قابل قبول نہیں تھا۔ ان مشکلات کے باوجود اسلام
کا معجز نما مذہب و کلچر یہاں پروان چڑھنے لگا۔ تصوف کا فروغ ہوا اور آج
اس ملک کا ایک مستحکم مذہب ہے۔

فرقہ قادیان کی تولید و ترویج

بدبخت استعمار نے اسلام کو زیر کرنے کے لیے ہر قسم کے
ہتھکنڈے استعمال کیے۔ برصغیر ہند و پاک کے برطانوی استعمار نے قادیانی نام کا
ایک نیا مذہب قائم کر کے امت مسلمہ کی تفریق کا سامان فراہم کیا۔ وحدت کو پارہ پارہ
کر دیا۔ گھر گھر میں دو فرقے کھڑے ہو گئے، پھر انہیں قادیانی فرقہ کو دو بازوؤں میں تقسیم کر دیا،
ایک احمدی لاہوری کے نام سے موسوم ہوا اور دوسرا قادیانی کے نام سے۔ وحدت
امت کو ختم کرنے کے لیے یہ فتنہ کھڑا کیا کہ احمدی لاہوری "مسلمان تھے"۔ اس طرح خود
فرقہ قادیان میں دو جماعتیں باہم متحارب کھڑی کر دیں۔ حالانکہ دونوں ایک ہی بونٹ
کے دو وال تھے۔ قادیانی تحریک کو عالمی تحریک بنانے کی سعی جاری رہی اور اس کے
عظیم قائدین نے عالمی دورہ کر کے ہر جگہ اس کی شاخیں قائم کر ڈالیں۔ براعظم افریقہ
جو خود صدیوں زیر استعمار رہا۔ تعلیم اور ترقی میں پسماندہ رہا۔ قادیانیوں نے افریقہ میں
اپنی تحریک کو تیز گام بنانے کے لیے ہر ملک میں اپنی جماعت کی شاخیں قائم کر ڈالیں۔

جنوبی افریقہ چونکہ براعظم افریقہ کا سب سے نمایاں ترقی یافتہ اور دولت مند ملک تھا
اس لیے قادیانیوں نے اس پر نظر گڑائی اور براعظم میں اسی کو اپنی تحریک کا مرکزی قلعہ
بنایا۔ سر ظفر اللہ خاں۔ نور نظر برطانیہ بنفس نفیس جنوبی افریقہ تشریف لائے اور
شہر کیپ ٹاؤن میں ایک مرکز قائم کر کے واپس تشریف لے گئے۔ قادیانی عقائد کی اشاعت
کے لیے وہی ذرائع اختیار کیے گئے جو برصغیر میں استعمال کیے گئے تھے، مثلاً ذہین طلبہ
کو آکسفورڈ اور کیمبرج کے تعلیمی وظائف دے کر ان کی ذہنی اور تعلیمی تربیت مادر برطانیہ
میں کی گئی۔ جس نے اس فرقہ کو جنم دیا تھا۔ پاکستان میں فرقہ قادیان کو غیر مسلم قرار دینے
کے بعد فرقہ کا مرکز مادر برطانیہ منتقل ہو گیا، جہاں سے مبلغ سارے عالم میں بھیجے جاتے
رہے اور جنوبی افریقہ بھی آتے رہے۔

جنوبی افریقہ میں قادیانی تحریک

جنوبی افریقہ میں قادیانی تبلیغ خفیہ طور پر چلتی رہی کیونکہ
یہاں کے مسلمان نہ صرف متقشف تھے بلکہ پاکستانی دستور میں قادیانیوں کے مرتد
یا غیر مسلم ہونے کا اعلان ہوتے ہی یہاں کے مسلمان ہوشیار ہو گئے اور ہر قادیانی
سرگرمی پر نظر رکھنے لگے۔ مساجد میں ان کے داخلہ پر پابندیاں لگا دیں وغیرہ۔
برصغیر کے باہر قادیانیوں نے اپنے تحفظ کے لیے قانونی چارہ جوئی شروع کی۔
اور سکولر SECULAR عدالتوں میں مقدمات دائر کیے کہ انہیں مذہبی اقلیت
کی حیثیت سے قانونی تحفظ فراہم کیا جائے۔ اسلام دشمن سکولر عدالتیں جنوبی افریقہ
میں بھی ان کو تحفظ دینے کے لیے آمادہ نظر آئیں اور ایسے فیصلے صادر کیے جن سے
قادیانیوں کو تقویت ہوئی اور وہ مسلم مساجد و قبرستان میں شرکت کا دعویٰ کرنے لگے
یہاں انہوں نے اپنے آپ کو احمدی لاہوری مسلم فرقہ قرار دے کر آنکھوں میں دھول

جھونکا اور مسلمان ہونے کا دعوی کر دیا۔

مسلم مساجد میں قادیانیوں کی آمد یا مسلم قبرستان میں ان کی تجہیز و تکفین کو مسلمانوں نے پسند نہ کیا اور مزاحمت شروع کی۔ بات آگے بڑھی اور قادیانیوں نے سکولر عدالتوں میں مقدمات دائر کیے۔ مادر برطانیہ اور امریکہ سے قادیانی مبلغین اور وکلاء طلب کیے گئے تاکہ وہ ان کے مقدمات کی پیروی کریں۔ اس طرح جنوبی افریقہ کا معروف قادیانی مقدمہ (CASE) منظر عام پر آیا اور ۱۹۸۲ء سے ۱۹۹۵ء تک چلتا رہا۔

کیپ ٹاؤن کا قادیانی مقدمہ کیپ ٹاؤن کی سپریم کورٹ میں قادیانیوں نے مقدمہ دائر کیا کہ وہ بحیثیت احمدی لاہوری مسلم ہیں اور مسلم حقوق کے حقدار بھی ہیں۔ انہیں مساجد میں داخل ہونے اور مقابر میں تدفین اور تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے اور ان کے مسلم حقوق بحال کیے جائیں۔ سپریم کورٹ میں احمدی لاہوری بحیثیت مدعی (APPALENT) اور مسلم جوڈیشیل کانسل (M.J.C) مدعی علیہ (DEFENDENT) کی حیثیت سے حاضر ہوئے۔ راقم الحروف بھی روز اول سے اکسپرٹ ڈیفنس مقدمہ میں شریک رہا۔ مقدمہ کی سماعت (HEARING) دو محور پر گردش کرتی رہی۔ اول یہ کہ آیا احمدی اور لاہوری مسلم ہیں یا مرتد۔ دوم یہ کہ آیا سکولر عدالت کو کسی مذہبی کمونٹی کے عقائد کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟ ام۔ جے۔ سی (M.J.C) کا موقف دونوں مسائل میں واضح تھا۔ یعنی احمدی اور لاہوری بھی غیر مسلم تھے اور مذہبی عقائد کے مقابلہ میں سکولر عدالت کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہے۔

جج برمن (BERMAN) نے بڑی جسارت کے ساتھ یہ فیصلہ صادر کر دیا

کہ سکولر (SECULAR) عدالت قطعی مجاز ہے کہ وہ مذہبی عقائد سے متعلق مسائل میں بھی اپنے فیصلے صادر کرے، بلکہ ان معاملات میں سکولر عدالت زیادہ باصلاحیت (COMPETENT) ہے۔ اس کا فیصلہ خالص انصاف پر مبنی ہوگا اور غیر جانبدارانہ بھی۔ فیصلہ کے اصل کلمات جسے سپریم کورٹ (عدالت عالیہ ملبوم فنٹش) نے اپنے فیصلے (JUDGEMENT) کے صفحات ۳۳-۳۴ پر نقل کیا ہے، حسب ذیل تھے:

"—— it appears to me that the resolution of the question whether Ahmadies are Muslims or not may well be more fairly and dispassionately decided by a secular court such as this than by some other tribunal composed of theologians. Certainly when regard is had to the considerable number of experts to be called and the considerable volume of testimony to be given by them, this court may well be the most suitable forum to deal with them and with their evidence."

"احمدی مسلمان ہیں یا نہیں؟ اس سوال کے تجزیہ کے بارے میں مجھے یہ لگتا ہے کہ اس کا فیصلہ ماہرین مذہب کی تشکیل شدہ عدالت کے مقابلہ میں ایک لادینی عدالت جیسی کہ یہ عدالت ہے زیادہ انصاف اور بے تعصبی کے ساتھ کر سکتی ہے اور ایسی حالت میں جب کہ ماہرین کی ایک معتدبہ تعداد کو بلایا جانا ہو اور حلفی و تصدیقی بیانوں کا خاصا بڑا حجم ان کی جانب سے پیش کیا جانے والا ہو، ایسی حالت میں ان سے اور ان کی شہادتوں سے نبٹنے کے لیے یہ عدالت موزوں ترین جگہ ہو سکتی ہے۔"

سماعت ثانیہ ام۔ جے۔ سی نے عدالت کے فیصلہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور مقدمہ کو مشترک عدالت سے خارج کرنے کی درخواست کی۔ مقدمہ کی سماعت ثانیہ نومبر ۱۹۸۵ء میں شروع ہوئی۔ مسلم وکیل اسماعیل محمد نے اعلان کر دیا کہ مذہبی مسائل میں سکولر کورٹ کا فیصلہ مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہے،

مشرک عدالت اس کی مجاز نہیں کہ وہ کسی کو مسلم اور کسی کو مرتد قرار دے۔ ام۔ جے۔ سی نے مقدمہ کا بائیکاٹ کیا۔ ۲۰ نومبر ۱۹۸۵ء کو جج ولیم نے فیصلہ صادر کردیا کہ احمدی لاہوری چونکہ مسلمان ہیں لہذا ان کے مسلم حقوق بحال کیے جائیں، مساجد میں داخلہ اور قبرستان میں تجہیز و تکفین کی اجازت دی جائے۔ حکم عدولی کی سزا سخت ہوگی اور اسے توہین عدالت (CONTEMPT OF CUART) قرار دیا جائے گا۔

مسلمانوں نے عدالت کے فیصلہ کو مسترد کردیا اور اعلان کردیا کہ لاہوری احمدی بھی قادیانیوں کی طرح غیر مسلم تھے۔ ایک کافر جج دوسرے کافر کو مسلم قرار نہیں دے سکتا ہے۔ ام۔ جے۔ سی (M.J.C) نے تمام مساجد کے ائمہ اور اراکین کمیٹی کو ہدایت جاری کردی کہ وہ کسی بھی قادیانی۔ احمدی لاہوری یا ان کے حمایتی اور طرفداروں کو مساجد میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں اور مسلم قبرستان میں ان کی تدفین کی مزاحمت کریں۔ یہ اعلان بھی کردیا کہ ہر مسلمان عدالت کی حکم عدولی کی سزا اور جیل جانے کے لیے تیار رہے۔ جج ولیم کے فیصلہ کی روشنی میں قادیانی اور لاہوری احمدی جسارت کے ساتھ مساجد میں داخل ہونے لگے۔ اس سے فرقہ وارانہ کشمکش میں اضافہ ہوا اور تصادم کے خطرات بڑھنے لگے۔ مساجد اور مقا[بر] میں ان کی مداخلت سے شہر میں فساد کا خطرہ پیدا ہوا۔

ملک کی عدالت عالیہ میں اپیل مسلم جوڈیشیل کانسل (ام۔ جے۔ سی (M.J.C) نے ملک کی سب سے بڑی عدالت (بلوم فاؤنٹین) میں جج برمن اور جج ولیم کے فیصلہ کے خلاف اپیل دائر کی اور دعوی کیا کہ غیر مسلم عدالت (سکولر کورٹ) کو کسی فرقہ کے

مذہبی عقائد سے متعلق حکم صادر کرنے کا حق نہیں ہے۔ یہ فیصلے مسلم کمیونٹی کے لیے قابل قبول نہیں ہیں۔

یہ مقدمہ (CASE نمبر ۲۰۱/۱۹۹۲) عدالت عالیہ کے بنچ میں پانچ عالی ججوں کے سامنے پیش ہوا اور اس کی سماعت ۲۱، ۲۲، ۲۴، ۲۵، ۲۸ اور ۲۹ اگست ۱۹۹۵ء کو جاری رہی۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۹۵ء کو ججوں نے ۱۷۱ صفحات پر مشتمل اپنا فیصلہ صادر کردیا اور صفحات ۱۵۴ اور ۱۵۵ پر سابق ججوں کے فیصلوں کو مسترد کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اعلان کردیا کہ:

"کسی کمیونٹی کے مذہبی عقائد کے بارے میں فیصلہ خود اس کمیونٹی کے علماء اور ماہرین عقائد ہی جو اس عقیدہ کے محافظ، امین اور مجاز ہیں کر سکتے ہیں۔ صرف انہیں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ صادر کریں کہ کس فرد کے عقائد مذہب کے تسلیم شدہ عقائد کے مطابق ہیں اور کس فرد کے عقائد اس کے مخالف ہیں، اس حق کو کوئی عدالت یا فرقہ سلب نہیں کر سکتا ہے۔ سکولر یا دنیاوی عدالت کے لیے غیر موزوں ہے کہ وہ فیصلہ صادر کرے کہ کون مسلمان ہے اور کون مرتد ہے۔ کسی فرد کو مذہب کے دائرہ سے خارج کرنے (EXCOMMUNICATE) کرنے کا حق بھی علمائے کبار کو حاصل ہے"۔

فیصلے کے اصل الفاظ حسب ذیل ہیں:

One cannot deny the right to those who are legitimately charged with the protection of the Muslim faith to seek to safeguard what they consider to be the fundamental and critical tenets of their faith, and to excommuniate someone whose convictions and benefits are in opposition to, or not in conformity with, those principles.

ججوں نے فیصلہ میں لاڈ دیوی (LORD DAVY) کے تبصرے کو بھی اپنی حمایت میں پیش کیا ہے (ص۱۵۴)۔ نیز اسکاٹ لینڈ کے فری چرچ کے مقدمہ سے متعلق لاڈ ہیلیسبری (LARD HALSBURY) کے فیصلوں کو بھی اپنی تائید میں پیش کیا ہے (ص۱۵۵) ان فیصلوں کے مطابق بھی مذہبی عقائد کے سلسلہ میں سکولر عدالتیں فیصلہ صادر نہیں کر سکتی ہیں۔ ماورائی مسائل میں لادینی عدالتیں حکم نہیں بن سکتی ہیں۔

جنوبی افریقہ کی عدالت عالیہ کا یہ فیصلہ اب ایک عالمی نظیر ہے۔ دنیا کی کسی عدالت میں قادیانی فرقہ یا احمدی اور لاہوری فرقہ منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ کوئی سکولر عدالت ان فرقوں کو حق تحفظ دینے کی مستحق نہیں۔ ان کے بارے میں حتمی فیصلہ امت مسلمہ کے علمائے کبار اور مذہب و عقائد کے ماہرین ہی کر سکتے ہیں۔ اگر وہ انہیں غیر مسلم یا مرتد قرار دے چکے ہیں تو کوئی سکولر عدالت انہیں مسلم قرار نہیں دے سکتی ہے۔ قادیانی جو عام طور پر سکولر عدالتوں کا سہارا لے کر اپنے حقوق کا تحفظ حاصل کیا کرتے تھے۔ اب وہ اس فیصلہ کن نظیر کی روشنی میں اس سے محروم ہو چکے ہیں۔ مادر برطانیہ جس کی کوکھ سے اس فرقہ نے جنم لیا ہے۔ وہ بھی اپنی غیر محرم نسل کی حفاظت نہیں کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے جنوبی افریقہ کی عدالت عالیہ کا فیصلہ عالمی نظیر کی حیثیت رکھتا ہے اور عقائد کے مقدمات (DOCTRINAL AND ECCLESIASTICAL) کی سماعت کا حق نہ تو یورپ کی عدالتوں کو ہے نہ ہی امریکی یا غیر امریکی عدالتوں کو ہے۔ برصغیر ہند و پاک کے لیے یہ فیصلہ سب سے اہم ہے کیونکہ یہاں یہ تحریک ہنوز سرگرم عمل ہے۔

مقدمات کے طویل ریکارڈ کا تحفظ

تقریباً پندرہ سالوں کے طویل مقدمات کے بعد عدالتی کاغذات، فائل اور متعلقہ ریکارڈ کیپ ٹاون کے نوجوان وکیل (اٹرنی) مسٹر احمد چوہان (AA CHOHAN) کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ محققین اور ریسرچ اسکالر ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ موصوف اس مقدمہ میں روز اول سے روز آخر تک متعلق رہے ہیں۔ قادیانی تحریک اب جنوبی افریقہ میں درگور ہو چکی ہے تحریک ارتداد کے کفن میں یہ فیصلہ آخری کیل تھی۔

دو اہم نظائر

پانچ ججوں نے اپنے فیصلوں کی تائید میں دو اہم نظائر پیش کیے ہیں وہ بھی پیش نظر رہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

• حضرات! میں اس ملک میں اس عدالت یا کسی شہری عدالت کے کسی ایسے حق کو تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں جو اس مذہب یا کسی دوسری مذہبی تنظیم کے عقائد کی صداقت و معقولیت سے بحث کرے یا یہ فیصلہ کرے کہ ان میں کوئی عقیدہ اپنے صحیفہ کی زبان کی ترجمانی پر مبنی ہے یا نہیں ہے یا یہ کہ عقیدہ کے مختلف بیانات کے درمیان تناقض و تضاد حقیقی یا واضح ہیں یا نہیں ہیں، یا یہ کہ یہ تضادات ایک کامل اور لامحدود و ہمہ گیر ذات کے بارے میں کسی محدود ناقص تصور سے پیدا ہو رہے یا نہیں پیدا ہو رہے ہیں یا ایسے ہی کسی اور سوال پر بحث یا فیصلہ کرے۔"

دردمند لوگوں سے گذارش ہے کہ وہ اردو اور انگریزی میں اس فیصلہ کو شایع کر کے عنداللہ ماجور ہوں۔

رسالہ اہل سنت والجماعت

از مولانا سید سلیمان ندویؒ

صفحے ۵۲ قیمت ۱۰ روپے

اخبار علمیہ

حال ہی میں لندن سے ایک نہایت مفید اور پُر از معلومات کتاب 'دی انسائیکلو پیڈیا آف اسلامک بینکنگ اینڈ انشورنس' کے نام سے شایع ہوئی، اس میں موضوع کے بنیادی مباحث اور ان کی تمام جزئیات کا اس خوبی سے استقصار کیا گیا ہے کہ معاصر امپیکٹ لندن کے فاضل مبصر کے الفاظ میں یہ کتاب صحیح معنوں میں قاموس اور انسائیکلو پیڈیا ہے، اسلام کا نظریہ معاشیات صرف غیر سودی بینک کاری تک محدود نہیں، یہ کہنا بھی کافی نہیں ہے کہ یہ مغرب کی سودی بینک کاری کی متبادل شکل ہے بلکہ یہ ایک نظام ہے جس میں معاشرہ و معاشیات کا اسلامی تصور اور نظریہ مذہب مکمل شکل میں جاری وساری ہے اور جہاں احتیاط و تقوی کی بنیاد پر ایک وسیع تر معاشرہ کا مفاد مقصود ہے، اس قاموس میں اسلام کے اقتصادی نظریہ و عمل پر بحث کے علاوہ اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ البانیہ سے امریکہ تک اسلامی اقتصادی اداروں کا جائزہ بھی لیا گیا ہے، موجودہ مغربی سودی بینک کاری کو فروغ ڈھائی سو سال سے ہوا اور اسلامی بینک کے غیر سودی نظام نے گذشتہ تین دہائیوں سے اپنی موجودگی اور اہمیت کا احساس دلایا ہے، مصر میں سنہ ۱۹۶۳ء میں ایک بینک نے مضاربت کے اصول پر کام شروع کیا تھا لیکن سنہ ۱۹۷۵ء میں جدہ میں اسلامک ڈیولپمنٹ بینک قائم ہونے سے اسلامی بینک کاری کو خاطر خواہ بہتری ملی اب عالمی سطح پر سو سے زیادہ ایسے بینک ہیں جو سود کی لعنت سے آزاد ہو کر کام کر رہے ہیں، ان کے علاوہ مغرب کے چند اہم معاشی ادارے جیسے این

ورٹ بنسن سیکوریٹیز، اے این زیڈ گرنڈلیز اور سٹی بینک وغیرہ میں ایسی خصوصی اکائیاں بھی ہیں جو سود سے آزاد ہیں۔ اس قاموس کی اشاعت سے بجا طور پر یہ توقع کی گئی ہے کہ امریکی اور یوروپی معاشی حلقوں کے محدود نقطہ نظر میں وسعت آئے گی اور ان کے لیے غیر سودی بینک کاری میں بھی ایسے امکانات نظر آئیں گے جہاں وہ پیداوار اور سرمایہ کی ترقی دیکھ سکیں گے۔

اردو کی خدمت کے لیے معروف و نیک نام پاکستانی ادارہ مقتدرہ قومی زبان کا ذکر ان صفحات میں آتا رہتا ہے اب اس کے ترجمان رسالہ اخبار اردو سے معلوم ہوا کہ اس کا تازہ ترین کارنامہ بچوں کی لغت ہے، پہلی سے دسویں جماعت تک نصابی ادب کی یہ لغت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اردو میں پہلی مبسوط کاوش سمجھی گئی ہے اس میں الفاظ کے معنی تجنیس، تلفظ، واحد جمع، متضاد الفاظ کے علاوہ محاورات پر مشتمل سات سو اٹھائیس صفحات میں دس ہزار الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں اس انوکھی اور مفید کتاب کی تدوین و اشاعت کے لیے مرتب جناب پروفیسر خلیق احمد صدیقی اور مقتدرہ قومی زبان مبارکباد اور تحسین و آفریں کے لائق ہیں۔

مقتدرہ قومی زبان نے سنہ ۱۹۹۷ء میں قیام پاکستان کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر عالمی زبانوں کی ایسی اہم کتابوں کے ترجمہ کا منصوبہ بنایا ہے جنھوں نے انسانی ذہن کو عالمگیر پیمانہ پر متاثر کیا ہے اور جن کی اثر آفرینی اور افادیت اب بھی برقرار ہے، یہ انتخاب آسان نہیں خاصا دشوار کام ہے، اس لیے ادارہ نے اصحاب فکر و دانش سے درخواست کی ہے کہ وہ سائنسی و عمرانی علوم سے متعلق دس قدیم و جدید کتابوں کا انتخاب کر کے مقتدرہ کو بھیج دیں تاکہ یہ کام آسان ہونے کے ساتھ جامع و ہمہ گیر بھی بن جائے۔

ع۔ ص۔

ادبیات

غزل

از جناب رئیس نعمانی۔ علی گڑھ

درمانِ دردہای درون، خواستم نشد
تعبیرِ خوابہای جنون، خواستم نشد

روشن نشد مآلِ تمنای زندگی
یا بم امان نہ بختِ زبون، خواستم نشد

یک لحظہ تیر ہای حوادث امان نداد
بیرون روم ز درطۂ خون، خواستم نشد

سودای آرزوی نگارِ سمن بری
از سر بہ چارہ ہای بروں، خواستم نشد

آن نکتہ بین بہ ارزشِ حرفم رضا نداد
تفسیرِ ہر چہ گونہ و چون، خواستم نشد

آگہ نیم کہ کار بہ آخر کجا رسد
امّا، ہر آنچہ تا بہ کنون، خواستم نشد

در زندگی رسم بہ مرادِ دلم رئیس
جستم بہ عقل و ہم بہ جنون، خواستم نشد

غزل

از جناب وسیم انصاری ردولوی (مرحوم)

تجلّی کو ہر اک گوشہ میں رقصاں کون دیکھے گا
مرے ہوتے جمالِ برقِ تاباں کون دیکھے گا

ہمیں پر ختم کر دو اپنی زلفوں کی پریشانی
ہمارے بعد یہ زلفِ پریشاں کون دیکھے گا

لٹا بھی دے نگاہِ مست پر سرمایۂ ایماں
سلامت بھی رہا ایماں تو ایماں کون دیکھے گا

ہمارے ساتھ آئے میکدہ میں ہم دکھلائیں
تجلّیِ چراغِ نورِ ایماں کون دیکھے گا

غنیمت ہے مرے ناصح کہ باز آجا نصیحت سے
خبر بھی ہے تجھے یہ فردِ عصیاں کون دیکھے گا

چمن آرائیاں کس کے لیے ہوتی ہیں دیوانے
یہاں کون آئے گا حسنِ بیاباں کون دیکھے گا

مطبوعاتِ جدیدہ

نماز، فضائل، احکام اور آداب

از جناب محمد رفیع الدین فاروقی

متوسط تقطیع، کاغذ و طباعت عمدہ، صفحات ۵۱۷، قیمت ۸۱ روپے، پتہ: محمد رفیع الدین فاروقی ۲-۶-۲۲-۲-۲۳، پنج محلہ روڈ۔ چار مینار حیدرآباد دکن ۲....۵۔

نماز کے فضائل و مسائل پر اردو زبان میں بڑا ذخیرہ پہلے سے موجود ہے، اس نئی کتاب کی ضرورت مولف نے اس لیے محسوس کی کہ عموماً قدیم کتابوں کی زبان ترتیب و پیرایہ بیان مشکل ہوتا ہے اور وہ عربی و فارسی الفاظ، ترکیبوں اور اصطلاحات سے بوجھل ہونے کی وجہ سے اب عام فہم بھی نہیں رہ گئی ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے مثالوں سے یہ بھی بتایا ہے کہ ان میں معلومات ادھوری اور نامکمل ہیں، اس لیے انہوں نے چند سال پہلے نماز کے ضروری مسائل کے عنوان سے شرح و بسط کے ساتھ تین حصے مرتب کرکے شایع کیے تھے، زیر نظر کتاب میں ان کو مزید دو ابواب کے اضافہ کے بعد شایع کیا گیا ہے، پہلے حصہ میں فضائل و فوائد کے علاوہ شریعت کی چند بنیادی اصطلاحوں اور بعض اوامر و نواہی کو بیان کیا گیا ہے، دوسرے حصہ میں نماز کے احکام و آداب ہیں، ضمناً ان میں کنوئیں اور قربانی و عقیقہ و صدقۂ فطر وغیرہ کے مسائل بھی آگئے ہیں، تیسرے حصہ میں بیماری و موت اور زیارت قبر کے مسائل شامل کیے گئے ہیں، اس طرح یہ کتاب نماز اور اس کے متعلقات پر بڑی جامع ہے، کتاب کی سب سے بڑی خوبی زبان و بیان کا انتہائی آسان، عام فہم اور دلنشیں ہونا ہے، اس کی وجہ سے مسائل کی تفہیم

ساتھ ہی ترغیب و تشویق کا اسلوب بھی بڑا دلکش ہے، جابجا بعض اعتراضات و اشکالات کو بھی رفع کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں تیمم اور سمت قبلہ کی بحث خاص طور پر قابل ذکر ہے، لحن جلی و خفی کا فرق بھی عمدگی سے واضح کیا ہے، البتہ بعض مسائل میں مزید احتیاط کی گنجائش تھی مثلاً امام کے محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کو مکروہ تحریمی بتایا گیا ہے جبکہ مولانا تھانوی نے بہشتی زیور میں اسے مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، چونکہ حوالوں کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے اس لیے بعض مسائل میں تشویش ہوتی ہے، زبان میں بعض علاقائی تعبیریں دوسروں کے لیے نامانوس ہیں، مثلاً بجائے نہانے کے پانی نہانا، پان کی دوکان کے لیے پان کا ڈبہ چلانا وغیرہ، کمپیوٹر کی کتابت اگرچہ صاف ہے تاہم اغلاط زیادہ ہیں، آخر میں ان کی ایک فہرست بھی ہے لیکن بعض غلطیاں اس میں بھی درج ہونے سے رہ گئی ہیں۔

مغربی فلسفہ تعلیم کا تنقیدی مطالعہ

از جناب پروفیسر سید محمد سلیم

متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت، صفحات ۲۰۵، قیمت ۴۰ روپے، پتہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، ۱۳۵۳، چتلی قبر، دہلی ۶۔

مغربی نظام تعلیم کی ظاہری چمک اور اس کی افادیت کے پرشور دعووں کے باوجود دوربین نظروں نے روز اول سے اس کے خطرات و مفسدات کو بھانپ لیا تھا، چنانچہ انھوں نے وقتاً فوقتاً اس کی مخالفت یا اصلاح کی کوششیں جاری رکھیں اور اس کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھنے کا اہم فریضہ انجام دیا، لیکن ضرورت تھی کہ اس نظام تعلیم کے بنیادی افکار و نظریات کا گہرائی سے جائزہ لیا جاتا جن کی جن کی وجہ سے اس کی خشت اول ہی کج رہی، زیر نظر کتاب اسی مقصد کے تحت

لکھی گئی، اس میں کلیسائی معاشرہ اور کلیسا کی شکست کے بعد لادینی نظریہ کی فتح و فروغ کی تاریخ میں یورپ کے موجودہ معاشرہ اور نظام تعلیم کی روح کو تلاش کیا گیا ہے۔

ایجادات و اختراعات میں کامیابی کے باوجود لادینی نظریات نے مغربی معاشرہ کو جس انارکی اور فساد سے دوچار کیا، اس کا بہترین تجزیہ کیا گیا ہے، لادینی تحریک تعلیم گاہ میں، مغربی نظام تعلیم کی اقدار اور مقاصد تعلیم یہ تینوں باب خاص طور پر مطالعہ کے لائق ہیں، اس طویل بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشرے میں وہی تعلیم کامیاب رہتی ہے، جس کی سیرابی مذہب کے سرچشمہ سے ہوتی ہے اور یہ کہ موجودہ مغربی تعلیم جوہری انسان میں اور اس کے عارضی مظاہر میں تمیز کرنے میں بالکل ناکام رہی ہے۔

آخری باب میں بتایا گیا ہے کہ سرچشمہ صافی اسلام کا مذہب ہے اور دور جدید کی سائنسی فتوحات بھی دراصل اسلام کی برکت ہے۔

حیات و تصرفات صاحب گلشن چشت

از جناب اختر جمال قریشی

تقطیع متوسط، بہترین کاغذ و طباعت، مجلد، صفحات ۱۲۷، قیمت ۳۵ روپے، پتہ: ۲-اے ساگر اپارٹمنٹ، سونا پور لین، شاستری مارگ کرلا۔ ویسٹ بمبئی ۷۰۔

اس کتاب میں خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے ایک عاشق صادق اور ان کے سلسلہ کے مرشد سید عبدالحق شاہ کے سوانح اور تصرفات کو مرتب کیا گیا ہے، حیات کا حصہ تو مختصر ہے لیکن تصرفات تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں جن میں ابراہیم بلخی سے ملاقات، غوث اعظم کا دیدار، شیطان، جن سے مقابلہ، بعد از وصال مرید کو تعویذ عطا کرنا، رحم مادر میں لڑکا یا لڑکی کی تعیین اور تبلیغی جماعت سے مناظرہ و فتح وغیرہ جیسے واقعات ہیں، ایک خاص طبقہ میں ان سے دلچسپی سے انکار نہیں لیکن زیادہ

مفید اور بہتر ہوتا کہ حضرت کی تقریروں، مضامین اور ان ملفوظات و ارشادات کو محفوظ کرلیا جاتا جو انہوں نے اصلاح و تربیت کی غرض سے بیان کیے اور جن کی جانب مولانا نے بھی اشارہ کیا ہے، کتاب بہت خوبصورت چھپی ہے لیکن کتابت کی غلطیاں جابجا ہیں شہ سراط مستقیم، فنائیت، حاجت روئی وغیرہ، ایک جگہ عقیدت فہم کی ترکیب بھی انوکھی ہے۔

خامہ درخامہ مرتبہ جناب ڈاکٹر محمد علی اثر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ اور کتابت و طباعت مجلد مع خوبصورت ٹائٹل صفحات ۱۴۲ قیمت ۸۰ روپے پتہ: ۲۶، امیر النساء بیگم اسٹریٹ مدراس ۲۰۰۰۰۲

تامل ناڈو کے جناب علیم صبا نویدی کی ادبی فتوحات کا شہرہ اب صرف جنوبی ہند تک محدو نہیں ہے پوری اردو دنیا اب ان سے واقف ہے، انہوں نے تحقیق و تنقید و افسانہ نگاری میں کتابیں سپرد قلم کیں، شاعری میں انکے ایک درجن سے زائد شعری مجموعے شایع کرچکے ہیں اور اسی سے انکی اد رفتار کا اندازہ ہوتا ہے زیر نظر کتاب میں ان کی شاعری خصوصاً ان کے مجموعۂ کلام اثر خامہ کے محاسن جائزہ مختلف اہل قلم نے لیا ہے اور اس سے نویدی صاحب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کی ع عکاسی ہوتی ہے۔

اضطراب از جناب مضطر اعظمی، متوسط تقطیع بہترین کاغذ و طباعت صفحات ۱۷۶ قیمت ۷۰ روپے
پتہ: شارپ پبلیکیشن ۵، مولانا آزاد روڈ، غیبی نگر، بھیونڈی ۴۲۱۳۰۲، مہاراشٹر۔

حمد و نعت اور غزلوں و نظموں کا یہ خوبصورت مجموعہ جناب مضطر کی صلاحیتوں کا آئینہ ہے، ان کی صنعت سے وابستگی کے باوجود ان کے ذوق، فن اور احساس لطیف کو آلات نے کچلا نہیں، انکی شا میں پاکیزہ و بلند خیالات کے ساتھ عصر حاضر کی سیاست اور تہذیب جدید کی بے سم کا کرب نمایاں ہے، لفظ اضطراب کا انتخاب شعوری اور با معنی ہے، ایک شعر ملاحظہ ہو

شرم و حیا کے بوجھ سے آزاد ہوگیا   ہر فرد مثل آگ یہاں بے لباس ہے

ع۔ ص۔

دار المصنفین کی اہم ادبی کتابیں

شعر العجم حصہ اول: (علامہ شبلی نعمانی) فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد ترقی اور اس کی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے اور عباس مروزی سے نظامی تک کے تمام شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ قیمت ۳۰ روپے

شعر العجم حصہ دوم: شعرائے متوسطین خواجہ فریدالدین عطار سے حافظ و ابن یمین تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ سوم: شعرائے متاخرین فغانی سے ابوطالب کلیم تک کا تذکرہ مع تنقید کلام۔ قیمت ۲۵ روپے

شعر العجم حصہ چہارم: ایران کی آب و ہوا، تمدن اور دیگر اسباب کے شاعری پر اثرات و تغیرات دکھانے کے علاوہ تمام انواع شاعری میں سے مثنوی پر بسیط تبصرہ۔ قیمت ۳۵ روپے

شعر العجم حصہ پنجم: قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید۔ قیمت ۳۰ روپے

انتخابات شبلی: شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس میں کلام کے حسن و قبح، عیب و ہنر، شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے۔ قیمت ۲۵ روپے

کلیات شبلی (اردو): مولانا شبلی کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی قصائد اور تمام اخلاقی، سیاسی، مذہبی اور تاریخی نظمیں شامل ہیں۔ قیمت ۲۵ روپے

گل رعنا: (مولانا عبدالحئی مرحوم) اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بعہد اردو شعرا (ولی سے حالی و اکبر تک) کا حال اور آب حیات کی غلطیوں کی تصحیح، شروع میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا بصیرت افروز مقدمہ۔ قیمت ۶۰ روپے

نقوش سلیمانی: مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدمات، خطبات اور ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ جس میں اردو کے مولد کی تعیین کی کوشش کی گئی ہے۔ قیمت ۶۰ روپے

شعر الہند حصہ اول: (مولانا عبدالسلام ندوی) قدما کے دور سے جدید دور تک اردو شاعری کے تاریخی تغیر و انقلاب کی تفصیل اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ۔

شعر الہند حصہ دوم: (مولانا عبدالسلام ندوی) اردو شاعری کے تمام اصناف غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید۔ قیمت ۵۰ روپے

اقبال کامل: (مولانا عبدالسلام ندوی) ڈاکٹر اقبال کی مفصل سوانح حیات، فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کی تفصیل، ان کی اردو فارسی شاعری کی ادبی خوبیاں اور ان کے اہم موضوعات فلسفہ خودی و بیخودی نظریہ ملت، تعلیم سیاست صنف لطیف (عورت) فنون لطیفہ اور نظام اخلاق کی تشریح۔ قیمت ۴۰ روپے

اردو غزل: (ڈاکٹر یوسف حسین خاں) اردو غزل کی خصوصیات و محاسن اور ابتدا سے موجودہ دور تک کے معروف غزل گو شعرا کی غزلوں کا انتخاب۔ قیمت ۵۰ روپے